بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

سقوطِ عراق کے پس منظر میں

یک گریہ پس از ضبطِ دو صد گریہ رضا دہ
تا تلخیِ آں زہر توانم ز گلو برد

‘‘مسلمانو! تمہاری رگوں میں خون نہیں، تڑپنے اور مچلنے والی بجلیاں ہیں جو باطل کے خس وخاشاک کو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیں گی۔ تمہارے سینے متاعِ ملی کے امین ہیں۔ دنیا کی کوئی قوت اس امانت کو تم سے چھین نہیں سکتی۔ ہم نے دنیا کے روباہ بازانِ ازلی سے بارہا کہا کہ اس شیرِ نیستاں کو سویا رہنے دو۔ اسے مت چھیڑو۔ اسے مت اٹھاؤ۔ یہ جاگ اٹھا تو دنیا میں قیامت برپا کر دے گا۔ پھر تمہیں نہ زمین میں پناہ ملے گی نہ آسمان پر۔ تم اپنی جانیں بچانے کے لئے دنیا کی ہر طاقت سے فریاد کرو گے لیکن دنیا کی کوئی طاقت تمہاری مدد کے لئے نہیں پہنچ سکے گی۔ اس لئے کہ دنیا جانتی ہے کہ اس ضیغمِ یزدانی اور اسدِ غابۂ صمدانی سے پنجہ فگنی کے معنی خودکشی کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن ان عاقبت نااندیشوں نے ہماری اس پکار کو محض ہنسی سمجھا ہے۔ مسلمانو! تم کفر و باطل کے ان پجاریوں کے اس مردود چیلنج کو قبول کرو۔ اٹھو۔ بیدار ہو جاؤ اور دنیا کی ان ناہنجار قوتوں کو بتا دو کہ

> آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا
>
> اس میں شبہ نہیں کہ دشمن کے پاس ساز وسامان ہے۔ اس کے ہاں جیوش وعساکر ہیں۔ اس کے پاس گولہ اور بارود بھی ہے۔ لیکن جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ اس کے پاس نہیں ہے۔ تمہارے سینے میں توحید کی امانت ہے۔ تمہارے بازوؤں میں حیدری قوت ہے۔ تمہاری نگاہوں میں فاروقی دبدبہ ہے۔ تم میں شانِ قلندری ہے۔ دنیا کو اپنے ساز وسامان پر بھروسہ ہے۔ تمہیں اپنے ایمان پر بھروسہ ہے اور ایمان کی قوت وہ ہے جس کے سامنے دنیا کی کوئی قوت بھی ٹھہر نہیں سکتی۔
>
> کافر ہو تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
> مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی‘‘

آپ کسی جلسہ میں جائیں۔ ہر تقریر اسی قسم کی شعلہ فشانیوں سے فضا کو مسحور کرتی دکھائی دے گی۔ یہ جلسہ کسی پارک میں ہو یا صحنِ مسجد میں۔ اسمبلی کے ایوان میں ہو یا عیدگاہ کے میدان میں۔ آپ کہیں ہوں اور مقرر کوئی بھی ہو۔ بس چند الفاظ ہوں گے طنطنہ خیز اور چند فقرے ہوں گے ولولہ انگیز۔ مقرر کے منہ سے یہ دھواں دھار الفاظ جھاگ کی آمیزش سے نکلتے چلے جائیں گے اور فضا اللہ اکبر کے فلک بوس وکہکشاں گیر نعروں سے گونجتی رہے گی۔ اس کے بعد جلسہ ختم ہو جائے گا۔ کچھ وقت کے لئے اس تقریر کی شعلہ نوائی اور آتش فشانی کا چرچا رہے گا۔ اس کے بعد اسی قسم کے کسی اور ''مشاعرے'' کا انتظار ہونے لگے لگا۔ پہلے کا تو پتہ نہیں لیکن کم از کم گذشتہ نصف صدی سے تو یہی کچھ سنتے چلے آ رہے ہیں۔ کتنا ہی اہم مسئلہ درپیش ہو۔ کیسا ہی نازک سوال سامنے ہو۔ کتنے ہی مہیب خطرہ کا مقابلہ ہو۔ کیسی ہی جاں فرسا مصیبت سر پر منڈلا رہی ہو۔ ہمارا کوئی لیڈر یہ نہیں بتائے گا کہ مسئلہ کی نوعیت کیا ہے۔ اس کا مالہ‘ و ماعلیہ کیا ہے۔ یہ خطرہ کیوں پیدا ہو رہا ہے۔ یہ گھٹا ہمارے سروں پر کیوں منڈلا رہی ہے اور اب اس خطرہ کے مقابلہ کے لئے ہمارے سامنے کیا اسکیم ہے۔ ہم کیا کرنا چاہتے ہیں۔ ایسا کیوں کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ ان میں سے کوئی بات نہیں کہی جائے گی۔ بس کہا جائے گا تو یہ کہ تم خدا کی آسمانی آگ ہو اور یہ باطل کا خس وخاشاک۔ راکھ کا ڈھیر بنا کر

رکھ دو۔

جب تک پاکستان کا تصور نہیں ملا تھا، ہمارے ہاں اس قسم کی تقریریں ایک حد تک قابلِ فہم تھیں۔ اس لئے کہ اس وقت ہمارے سامنے کوئی واضح نصب العین اور کوئی متعین پروگرام نہ تھا۔ اس لئے جو خطرہ بھی ہمارے سامنے آتا، سوائے اس کے کہ ہم اس پر غم وغصہ کا اظہار کرتے، ہمارے لئے اور کوئی چارۂ کار ہی نہ تھا۔ پاکستان کا تصور ملنے کے ساتھ ہی خوش قسمتی سے زمامِ قیادت قائداعظم جیسے بارد منطقی (Cold Logician) کے ہاتھ میں آ گئی جو ہر مسئلہ کو دو اور دو چار کی طرح سمجھنے اور پانچ اور پانچ دس، کی طرح سلجھانے کے عادی تھے۔ پاکستان بن جانے کے بعد ہماری تاریخ نے ایک نیا ورق الٹا۔ اب ایک خطۂ زمین ہمارے پاس تھا جسے ہم نے ایک خاص مقصد کے لئے حاصل کیا تھا۔ اب ہماری منزل بھی متعین تھی اور راستہ بھی۔ ہمارے خطرات بھی واضح تھے اور ان کے حل بھی صاف صاف۔ اب نہ ہمارے مسائل موہوم تھے اور نہ ان کے سمجھنے اور سلجھانے کی شکلیں مبہم۔ لہٰذا اب ہمارے ہاں اس سابقہ ''شاعری'' کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ لیکن ہم گذشتہ نصف صدی سے دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے راہنما بدستور اسی ''بیت بازی'' میں الجھے ہوئے ہیں۔ وہی لفظی گورکھ دھندے۔ وہی لچھے دار تقریریں۔ وہی جذبات انگیز شعلہ فشانیاں اور وہی شاعرانہ رجز خوانیاں۔ اس نصف صدی میں ہماری مصیبتوں میں اضافہ پر اضافہ ہوتا گیا ہے۔ ملک کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی گئی ہے۔ قوم کی خوشحالی کی سطح پست سے پست ہوتی گئی ہے۔ دشمنوں کے مشئوم ارادے بد سے بدتر ہوتے گئے ہیں۔ ان کی طرف سے پیدا ہونے والے خطرات موہوم سے حقیقت بنتے چلے گئے ہیں۔ یہ سب ہوتا گیا ہے لیکن کیا مجال جو ہمارے ارباب حل وعقد کی ''شاعری'' میں ذرا سا بھی فرق آیا ہو۔ آپ غور کریں گے تو یہ حقیقت نکھر کر آپ کے سامنے آ جائے گی کہ انہوں نے کبھی قوم سے خطاب کرتے وقت یہ نہیں بتایا کہ اب ان کے زیرِغور کونسی (Problem) ہے۔ وہ کس گتھی کے سلجھانے میں مصروف ہیں۔ اس کے لئے انہوں نے اس وقت تک کیا عملی اقدام کیا ہے۔ اب ان کے سامنے کونسا پروگرام ہے۔ وہ قوم سے کیا چاہتے ہیں۔ قوم کو اس باب میں کیا کرنا چاہئے۔

ہم اپنے ان رہنمایانِ کرام کے جذبات کی تنقیص نہیں کرتے لیکن اس کے باوجود، ہم اسے ''شاعری'' سے

اس لئے تعبیر کرنے پر مجبور ہیں کہ قوموں کے مسائل محض جذبات سے حل نہیں ہوا کرتے۔ جو لوگ موہوم تخیلات کی وادیوں سے نکل کر تلخ حقیقتوں کا سامنا کرنے کے عادی ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ

جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انہیں مذاقِ سخن نہیں ہے

ہماری قوم جذبات پرستیوں سے کافی پٹ چکی ہے۔ اب ضرورت ہے کہ انہیں حقائق کا سامنا کرنے کا عادی بنایا جائے۔ یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ جو مسئلہ پیش نظر ہو۔ اسے نہایت وضاحت سے قوم کے سامنے رکھا جائے۔ اسے اس کے مفید اور مضر پہلوؤں سے روشناس کرایا جائے۔ اس کے نتائج وعواقب سے آگاہ کیا جائے۔ پھر یہ سمجھا جائے کہ پاکستان اور اُمّتِ مسلمہ کے دشمنوں کی کیا چال ہے۔ ان کی تدبیریں کیا ہیں۔ ہم نے ان کا کیا حل سوچا ہے۔ اس کے بعد قوم سے کہا جائے کہ وہ اس مسئلہ پر غور کرے۔ اسے سوچے۔ سمجھے اور پھر بتائے کہ اس باب میں اس کا مشورہ کیا ہے۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے آپ قوم کا صحیح تعاون حاصل کر سکتے ہیں اور ان خطرات کا مقابلہ کر سکتے ہیں جن سے آئے دن مملکت پاکستان دوچار ہوتی رہتی ہے۔ اس قسم کی جذباتی اور مبہم تقریروں سے قوم اس نتیجہ پر پہنچتی ہے کہ یا تو ان مسائل کو آپ خود بھی اچھی طرح سے نہیں سمجھتے اور اگر سمجھتے ہیں تو آپ نے ان کے حل کے لئے کوئی موثر قدم نہیں اٹھایا‘ اس لئے اپنی بے عملی کو جذبات پرستی کے نقاب میں چھپا رہے ہیں۔ یہ صورت حال کسی طرح بھی خوش آئند نہیں۔ اس سے زیادہ سے زیادہ ایک وقتی گرمجوشی پیدا ہو جاتی ہے لیکن اس قسم کی گرمجوشی شراب کے نشے کی طرح ہوتی ہے جس کا خمار بے حد اضمحلال اور افسردگی پیدا کرتا ہے **’’واثمھا اکبر من نفعھا۔‘‘** اس کے اضمحلال کا نقصان اس کی گرمجوشی کے فائدے سے کہیں زیادہ ہے۔

ہمیں امید ہے کہ ہمارے یہ ارباب حل وعقد و رہنمایانِ عظام ہماری ان معروضات پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے۔۔ کہ

یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی

اطاعتِ رسول کے بارے میں دو متضاد زاویہ فکر

انبیائے کرامؑ پر فرض ہوتا تھا کہ جب بھی وحی کا نزول ہو وہ فوراً اس کو انسانیت تک پہنچا دیں، خواہ وہ نزول چلتی تلواروں کے دوران ہی کیوں نہ ہوا ہو۔ **بلغ ما انزل الیک من ربک۔** نیز یہ بھی فرض ہوتا تھا کہ وحی کے مطابق معاشرہ کی تعمیر کریں۔ اس دین کو متمکن کریں اور اس کو غالب کرنے کی کوشش کریں **لیظھرہ علی دین کلہ۔** حضور ﷺ نے ان ہدایات کے مطابق وحی کی تبلیغ فرمائی اور اس کے مطابق قرآنی حکومت قائم فرمائی، جو انسانیت کا بہترین دور تھا اور جسے چشم فلک دوبارہ دیکھنے کے لئے سرگرداں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا نظام، جسے حضور ﷺ نے عملاً اس روئے زمین پر قائم فرمایا۔ اس نظام کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت تھی۔ حضور ﷺ چونکہ اپنے دور میں اس نظام کے سربراہ تھے، اس لئے عملاً اس نظام کی اطاعت کے لئے حضور ﷺ کی اطاعت لازمی قرار پائی۔ کیونکہ اس نظام کی اطاعت حضور ﷺ کی اطاعت کے ذریعے ہی ممکن ہوسکتی تھی۔ حضور ﷺ کے بعد، حضرت ابوبکرؓ۔ حضرت عمرؓ کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت تھی۔ اور جب تک بھی وہ دور ممتد رہا، اس نظام کے سربراہ کی اطاعت، اللہ و رسول کی اطاعت تھی۔ جب ہم مسلمانوں میں ملوکیت در آئی، تو وہ نظام درہم برہم ہوگیا لیکن اللہ و رسول کی اطاعت تو ہر حال میں فرض تھی اس لئے یہ نظریہ رواج دیا گیا کہ قرآن کریم سے تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہوتی ہے اور حدیث شریف پر عمل کرنے سے حضور ﷺ کی اطاعت ہو جائے گی۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لئے احادیث کے ذخیرے جمع کئے گئے تا کہ حضور ﷺ کی اطاعت کا فرض ان پر عمل کر کے، پورا کر دیا جائے۔ اس مشکل کو حل کر دینے کے بعد اسلامی حکومت یا دین خداوندی کے **قیام** کی قطعاً کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ قرآن و حدیث پر الگ الگ عمل کرنے سے، اللہ و رسول کی اطاعت کا فرض ادا ہو جاتا ہے۔

یہ صورت حال ہم مسلمانوں میں تقریباً ایک ہزار سال سے چلی آ رہی تھی۔ ملوکیت کے طویل دور، اور اس کے بعد یورپ کے سامراجی غلبہ کی لمبی مدت کی وجہ سے مسلمانوں

میں اسلامی نظام کا تصور بالکل محو ہو گیا تھا۔ اور اس طویل عرصہ میں اطاعت رسول کے بارے میں بھی کبھی دو آراء پیدا نہیں ہوئیں۔ صرف ایک ہی طریقہ' یعنی احادیث پر عمل کرنا' اطاعت رسول کا مستند ذریعہ گردانا گیا۔ لیکن زمانے کے تقاضے اور فطرت کے اشارے کچھ اور ہی ہوتے ہیں۔ عقل انسانی کے خود ساختہ نظام ہائے زندگی نے انسانیت کو فوز و فلاح کی راہ نہیں دکھلائی۔ دکھ اور درد کا مارا ہوا مسلمان پھر اس بات پر مجبور ہوا کہ وہ قرآن کریم کے دامن میں اور اس کے نظام میں پناہ لے۔ گزشتہ تقریباً ایک سو سال سے رجعت الی القرآن کی آواز' مختلف گوشوں سے بلند ہونی شروع ہوئی۔ پہلے یہ آواز کمزور اور ضعیف بھی تھی اور قدرے غیر واضح بھی۔ لیکن مسلمانوں کے حالات اس درجہ نامساعد اور تباہ کن تھے کہ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ قرآن کریم کا نظام قائم کیا جائے اور اسی کو اپنا مطمح نظر بنائیں۔ اس میں اولیت کا شرف پاکستان کے مفکرین کو حاصل ہوا۔ اس کے بعد ایران' الجیریا' مصر' سیریا' سوڈان اور دیگر مسلمان ممالک میں یہ فکر عام ہوا۔

لیکن اس سارے فکر و عمل میں جو بات غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ روایتی اور ملوکیت کے تراشیدہ اسلام (جو ہمارے ہاں مروج ہے اور جو ہمارے دینی مدارس میں تعلیم دیا جاتا ہے) میں نظام کا کوئی تصور نہیں ہے اور اس میں اللہ و رسول کی اطاعت بھی قرآن و حدیث کے اتباع سے بخوبی ہو رہی ہے۔ پھر کونسی مشکل ہے جس کے باعث نظام قائم کیا جائے۔ اسلامی نظام کی ضرورت تو صرف اس صورت میں پیش آتی ہے کہ جب آپ اللہ و رسول کی اطاعت کو ایک اطاعت قرار دیں اور اس سے مقصود اسلامی حکومت کے سربراہ کو قرار دیں۔

اطاعت رسول کے دو الگ الگ اور واضح طریقے ہیں۔ ایک طریقہ تو وہی ہے جو ہمارے ہاں مروج چلا آ رہا ہے' یعنی قرآن و حدیث کا اتباع کریں اور ’’اللہ و رسول‘‘ کی اطاعت سے سبکدوش ہو جائیں۔ اس میں کسی قسم کے تردد کی ضرورت ہے نہ اسلامی نظام کی ضرورت۔ دنیا کے کسی ملک میں بھی اللہ و رسول کی اطاعت کی جا سکتی ہے اور اسی طرح اللہ و رسول کی اطاعت ہم کرتے ہیں آ رہے ہیں۔ لیکن دوسرا طریقہ اللہ و رسول کی اطاعت کا اسلامی نظام کے ذریعے ہے۔ آپ نظام قائم کریں۔ اس نظام کی اطاعت کریں اس سے اللہ و رسول کی اطاعت ہو گی۔ اس میں عملاً اس نظام کے سربراہ کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہو گی۔ اس صورت میں وہ نظام قرآن کریم کے اصول و اقدار کی روشنی میں' اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق' احکامات جاری کرے گا اور ان احکامات کی اطاعت' اللہ و رسول کی اطاعت ہو گی۔ یہ اطاعت رسول کا دوسرا طریقہ ہے۔ جو اول الذکر طریقہ سے بالکل منفرد

ہے۔ چونکہ یہ طریقہ، مروجہ طریقہ سے مختلف ہے۔ اس لئے اس طریقے کے داعین، خصوصاً ادارہ طلوع اسلام نے، اس طریقہ کے جواز میں واضح دلائل بھی پیش کئے اور تقریباً 50 سال میں کثیر تعداد میں مبسوط مضامین شائع کئے۔ جن کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ موضوع اس مختصر مضمون میں نہیں آ سکتا۔ فی الوقت گفتگو کا نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ اطاعت رسول کے دو جدا جدا طریقے پیش کئے جا رہے ہیں جن پر بالکل مختلف طور پر عمل پیرا ہوا جا سکتا ہے۔ حدیث کے اتباع کے ذریعے اطاعت رسول ہر معاشرہ میں (حتیٰ کہ سیکولر معاشرہ میں بھی) ممکن ہے، لیکن اسلامی نظام کے ذریعے اطاعت رسول صرف اس نظام میں ہی ممکن ہے جس نظام کے قیام کی اس دور میں دعوت دی جا رہی ہے۔ جو بات گہرے غور کی متقاضی ہے وہ یہ ہے کہ جو حضرات اسلامی نظام کے داعی ہیں انہیں تو ہر حال میں نظام کی اطاعت ہی اللہ و رسول کی اطاعت کا ذریعہ قرار دینا پڑے گی۔ ورنہ ان کے پاس نظام کے قیام کا کوئی محرک Incentive نہیں رہتا۔ نیز یہ کہ حدیث کی اطاعت سے رسول کی اطاعت مراد لینا، اسلامی نظام کے قیام میں رکاوٹ کا باعث بنتا ہے اور اس کے قیام کا جواز اور ضرورت بھی باقی نہیں رہتی ہے۔ جو حضرات حدیث کی اطاعت سے رسول کی اطاعت مراد لے کر مطمئن ہو جاتے ہیں انہیں یہ بھی غور فرمانا چاہئے کہ وہ حضرات قرآن کریم کو وحی جلی اور حدیث شریف کو وحی خفی گردانتے ہیں۔ جب وحی جلی یعنی قرآن کریم سے اللہ کی اطاعت ہوتی ہے، تو حدیث شریف، جو کہ وحی خفی ہے، اس سے حضورﷺ کی اطاعت کیسے ہوسکتی ہے، ایک وحی سے اللہ کی اطاعت اور دوسری وحی سے رسول کی اطاعت، چہ معنی دارد۔

آج سارا عالم اسلام مصائب سے دوچار ہے اور ہم مسلمان انسانیت کا آخری سہارا قرآن کریم کے نظام کو سمجھتے ہیں۔ خود قرآن کریم کا دعویٰ بھی یہی ہے۔ **ولن تجد من دونہ ملتحدا** (۲۷/ ۱۸) تم اس کے سوا کہیں بھی ہرگز پناہ کی جگہ نہ پاؤ گے۔ یہ مقام شکر ہے کہ اس دور میں تقریباً ہر مسلمان ملک میں اسلامی نظام کے دعاۃ موجود ہیں۔ آج سے پیشتر کبھی بھی اسلامی نظام کے قیام پر اس قدر اصرار نہیں ہوا۔ اب کرنے کا ضروری کام یہ ہے کہ اطاعت رسول کا مسئلہ، علمی انداز سے طے کر لیا جائے کیونکہ یہ مسئلہ اسلامی نظام کے قیام میں اساسی حیثیت کا حامل ہے۔ جب تک اطاعت رسول کا مسئلہ طے نہیں ہوگا، مختلف دعاۃ و تحاریک میں آپس میں تعاون و اشتراک عمل بھی ممکن نہیں ہے۔ اس لئے اسلامی نظام کے دعاۃ کو سب سے پہلے اس مسئلہ کو ضرور طے کر لینا چاہئے۔

وھھنا منا ثم الکلام
علی مصطفٰنا الوف سلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ثریا کوثر قیصرانی

(تیسری اور آخری قسط)

گوہر ہائے آب دار

(گذشتہ سے پیوستہ)

دوسری قسط اکتوبر ۲۰۰۲ء میں شائع ہوئی تھی۔

''قرآن کریم کی رو سے ہر شخص پر یہ فرض ہے کہ وہ اپنے پسماندگان کے لئے وصیت کر جائے اور جس کو جس قدر ضرورت ہو' اس کے مطابق اپنے ترکہ میں اس کے لئے حصہ مقرر کر دے۔ یہ جو قرآن میں حصے مقرر ہوئے ہیں تو یہ اس صورت میں بروئے کار آتے ہیں جب کوئی شخص کسی وجہ سے وصیت نہ کر سکے یا وصیت پورے ترکہ کو Cover نہ کرتی ہو۔

موجودہ قصہ میں متوفی نے وصیت نہ کی تو اس کی وجہ سے یہ سوال پیدا ہوا لیکن قرآن نے جو حصہ مقرر کیا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں کہ اگر اس بیوہ کی ضرورت اس سے پوری نہیں ہوتی تو اسے اس سے زیادہ دیا نہیں جا سکتا۔ اگر باقی وارث جذبۂ ہمدردی کے ماتحت چاہیں تو سارے کا سارا ترکہ اسے دیا جا سکتا ہے۔ قرآنی حصہ کی آڑ میں یہ کہنا کہ ہم مجبور ہیں کہ اس سے زیادہ اسے نہ دیا جائے' بالکل غلط ہے۔'' (مکتوبِ پرویز بنام بیگم بلند اختر' مورخہ 18/2/69)۔

☆☆☆

''ہمارے ہاں نوجوان طبقہ کی مصیبت یہ ہے کہ یہ رہتے تو ہیں مشرق میں اور سوچتے ہیں مغربی انداز میں۔ مغرب میں صورت یہ ہے کہ لڑکی جب سولہ برس کی ہو جائے تو وہ ماں باپ سے الگ ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد نہ اس کا کوئی تعلق ماں باپ سے رہتا ہے نہ ماں باپ کا اس سے کوئی واسطہ' اور نہ ہی معاشرہ پوچھتا ہے کہ ان کے باہمی تعلقات کیوں نہیں رہے۔ اس کے بعد لڑکی جہاں جی چاہے جائے۔ جس سے جی چاہے شادی کرے۔ اس شادی کا جو انجام بھی ہوتا ہو' ہو۔ ماں باپ پر اس کا کچھ اثر نہیں پڑتا۔ اس کے برعکس مشرق میں ابھی تک صورت یہ ہے کہ لڑکی ماں باپ کے ہاں رہے یا کہیں اور' اس کی برائی بھلائی کا اثر ماں باپ پر پڑتا ہے۔ اور پھر شادی کے بعد' میاں بیوی میں جب بھی ناخوشگواری ہو' اس کے نتائج ماں باپ کو بھگتنے پڑتے ہیں۔ سو

ان حالات میں ماں باپ یہ دیکھنے کے لئے مجبور ہوتے ہیں کہ جن فیصلوں کے نتائج اور عواقب انہوں نے بھگتنے ہیں وہ فیصلے صحیح ہو رہے ہیں یا نہیں اور اولاد ان کی اس احتیاط کو اپنی آزادی میں مداخلتِ بے جا تصور کر کے بگڑ بیٹھتی ہے۔

بات صاف ہے اگر اولاد کو مشرقی انداز سے رہنا ہے تو مغربی انداز سے سوچنا چھوڑ دینا ہوگا۔'' (مکتوبِ پرویز بنام بیگم بلند اختر' مورخہ 4/9/74)۔

☆☆☆

''(سرکش) بچوں کو خدا اور رسول اور قرآن کے واسطے سے کچھ سمجھانے کا کچھ فائدہ نہیں۔ انہیں تو ان کی Terms میں ہی سمجھانا چاہئے!

جنسیات کی نفسیات یہ ہے کہ لڑکا لڑکی جس قدر قریب ہوتے جائیں گے اتنی ہی ان کی باہمی کشش ماند پڑتی جائے گی۔ اگر شادی سے پیشتر یہ دور دور رہیں تو ان میں کشش بہت بڑھ جاتی ہے اور اس سے شادی بالعموم کامیاب رہتی ہے۔ دو تین سال تک قریب قریب ہونے سے تو یہ حرارت بجھ جاتی ہے۔ اس کے عواقب ہمیشہ افسوس ناک ہوتے ہیں۔ جو بچی یہ سمجھتی ہے کہ لڑکے کے قریب تر رہنے میں شادی کے امکانات زیادہ روشن ہوں گے۔ وہ صحیح نہیں ہے۔ ذہنی تعلق بے شک رکھا جائے لیکن جسمانی طور پر دور رہ کر۔ اس سے یہ رشتہ استوار رہے گا۔ ان خطوط پر سمجھانے سے شاید بات دل میں اتاری جا سکے ورنہ آج کل کی نسل کی سرکشی کوئی بات سننے کے لئے آمادہ نہیں ہوتی۔ اسے ''وعظ و نصیحت'' کے طور پر کچھ نہ سمجھایئے۔ نفسیاتی انداز سے سمجھانے کی کوشش کیجئے۔'' (مکتوبِ پرویز بنام بیگم بلند اختر' مورخہ 4/9/74)۔

☆☆☆

''میرے ساتھ اس دفعہ عجیب صورت ہوئی۔ بخار تو آٹھ دس دن تک آیا تھا لیکن اس کے ساتھ گلے اور کھانسی کی تکلیف ناقابل برداشت تھی۔ سب سے بڑا کرب یہ تھا کہ کھانسی کی وجہ سے راتیں بیٹھ کر گزارنی پڑتی تھیں اور گلے کی تکلیف کی شدت سے کچھ کھایا نہیں جاتا تھا۔ اس کی وجہ سے کمزوری بہت بڑھ گئی تھی اور شاید عمر کا تقاضا ہے کہ توانائی کی رفتار بڑی سست ہے۔ بیماری کے دوران یہ شدت آرزو دعا بن کر لب پہ آ جاتی تھی کہ عید میلاد النبیؐ کی تقریب پر اتنی توانائی میسر آ جائے کہ میں بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں اپنی نذر عقیدت حسب معمول اپنی زبان سے پیش کر سکوں۔ اللہ کا شکر ہے کہ مجھے یہ سعادت نصیب ہوگئی۔'' (مکتوبِ پرویز بنام بیگم بلند اختر' مورخہ 9/4/74)۔

☆☆☆

Islam over China'' قسم کی اکثر کتابیں میرے مطالعہ سے گذری ہیں۔ ایسی کتابوں کے مطالعہ کے وقت اس بات کی تلاش کیا کریں کہ کیا کسی نے اس اسلام کو بھی سمجھ کر قبول کیا ہے جسے قرآن پیش کرتا ہے یا محض روایتی اسلام ہی قبول کر لیا ہے۔'' (مکتوبِ پرویز بنام بیگم بلند اختر' مورخہ 8/7/74)۔

☆☆☆

''ختم نبوت پر کتاب میں نے مکمل کر لی ہے۔ آج

کل اس کی کتابت ہو رہی ہے۔ یہ بھی میرے ذمہ ایک قرض تھا جو بحمدہٖ اتر گیا۔

جو کچھ میں نے لکھا ہے احمدی صاحبان تو اس کی مخالفت کریں گے سو کریں گے' ہمارے علماء حضرات بھی مخالفت میں ان سے پیچھے نہیں رہیں گے۔ اس لئے کہ ختم نبوت کا قرآنی تصور پیش کرنے کے بعد' ہمارے علماء کے ہاتھ پلے بھی کچھ نہیں رہتا۔

موسےٰؑ کا یہ اژدھا ہامان کی سب رسیوں کو نگل جاتا ہے''۔ (مکتوبِ پرویز بنام بیگم بلند اختر' مورخہ 8/7/74)۔

☆☆☆

''آپ کے ہاں چوری کا واقعہ پریشانی کا موجب ہوا' اس لئے نہیں کہ کچھ چیزیں جاتی رہیں۔ زیادہ اس لئے کہ ایسے واقعات سے دل کو ایک دھڑکا سا لگ جاتا ہے۔ اس سے اعصاب پر بڑا برا اثر پڑتا ہے۔

آپ اس واقعہ کو فراموش کر دیجئے البتہ حفاظتی تدابیر پہلے سے زیادہ اختیار کیجئے۔ پولیس کے ہاں سے کسی کامیابی کی توقع نہ رکھئے۔ خدا کرے کہ وہ آپ کے ملازموں کو پریشان نہ کر رہے ہوں ورنہ اس سے دہری مصیبت کا سامان ہو جاتا ہے۔'' (مکتوبِ پرویز بنام بیگم بلند اختر' مورخہ 17/2/75)۔

☆☆☆

''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے' ہم نے اپنے ہاں بہائیوں کے متعلق کبھی کچھ تفصیل سے نہیں لکھا' یونہی ضمناً کہیں کہیں تذکرہ آ گیا ہے۔ ان لوگوں نے مذہبی یا سیاسی طور پر احمدیوں کی طرح کوئی موثر حیثیت اختیار نہیں کی۔'' (مکتوبِ پرویز بنام بیگم بلند اختر' مورخہ 17/2/75)۔

☆☆☆

''اسے ذہن میں رکھئے کہ کوئی (Community) جتنی چھوٹی ہو گی اتنا ہی ان میں باہمی ربط و ضبط' ہمدردی' تعاون' غمخواری وغیرہ کا جذبہ زیادہ ہو گا۔ یہ تحفظ خویش کے لئے ضروری ہوتا ہے۔

بہائی تو خیر ابھی نوزائیدہ ہیں آپ کے کراچی ہی میں بوہروں' آغا خانیوں' پارسیوں کو دیکھئے' ان میں باہمی کس قدر ربط و تعاون ہے۔ یہ چیزیں ان کے عقائد کا نتیجہ نہیں ہوتیں' تحفظِ خویش کے جذبہ کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

خود مسلمانوں میں بھی جو فرقے تھوڑی تعداد میں ہوتے ہیں ان میں باہمی ربط زیادہ ہوتا ہے۔ اس باب میں سنی من حیث الجماعت سب سے پیچھے ہیں۔ اس لئے کہ یہ تعداد میں سب سے زیادہ ہیں۔ اس لئے انہیں اپنے تحفظ کے لئے اس قسم کے رابطوں کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی اور اس لئے یہ پٹتے بھی رہتے ہیں۔'' (مکتوبِ پرویز بنام بیگم بلند اختر' مورخہ 17/2/75)۔

☆☆☆

''آپ کے دل میں خدمت خلق کا جو جذبہ بیدار ہوتا رہتا ہے یہ بڑی مبارک علامت ہے لیکن سوال عملی پروگرام کا ہے۔ میں لڑکوں یا مردوں کے مقابلہ میں لڑکیوں اور عورتوں کے لئے کچھ کرنے کو ترجیح دیتا ہوں۔ ہمارے

ہاں بڑی کثرت سے ایسی عورتیں ہیں جو بیوہ ہو کر یا خاوند کے مظالم وغیرہ کی وجہ سے بڑی بے بسی اور بے کسی کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ وہ کام کرنا چاہتی ہیں لیکن انہیں کوئی کام آتا نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی مخیّر اور منتظم عورت ایسا ادارہ کھول لے جس میں لاوارث لڑکیوں اور کس مپرس عورتوں کو ایسے کام سکھائے جائیں جن سے وہ روٹی کمانے کے قابل ہو جائیں تو یہ بہت بڑی خدمت خلق ہوگی۔ اگر آپ ان خطوط پر کچھ کریں تو اس سے بڑے اچھے نتائج مرتب ہو سکتے ہیں لیکن جو کچھ بھی آپ کرنا چاہیں' اس میں اس بات کو نہ بھولئے کہ ابتداً سب کچھ آپ کو تنہا کرنا پڑے گا۔ جب آپ جان مار کر ایسے ادارے کو پختہ بنیاد بنا لیں گی تو اس وقت تو آپ کو کوئی بے لوث ساتھی مل جائے اس سے پہلے نہیں مل سکتا۔ قرآنی مرکز کے قیام کے سلسلہ میں میرے ذہن میں ایک اس قسم کا ارادہ بھی ہے۔'' (مکتوبِ پرویز بنام بیگم بلند اختر' مورخہ 17/2/75)۔

☆☆☆

''شادی کے انتظامات کے سلسلہ میں میری مصروفیات اور بڑھ گئی ہیں۔ خدا کرے میں اس فریضہ سے بطریق احسن سبکدوش ہو جاؤں۔ لڑکی کو گھر سے وداع کرنے کا مسئلہ بڑا دشوار گذار ہوتا ہے۔ اس میں ہر معاملہ دوسرے فریق کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور ہم اس کے ماننے پر مجبور ہوتے ہیں لیکن موجودہ معاشرہ میں اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں!'' (مکتوبِ پرویز بنام بیگم بلند اختر' مورخہ 17/2/75)۔

☆☆☆

''گرنے والی قوم میں یہ عادت بھی عام ہو جاتی ہے کہ وہ کسی بات کی خود تحقیق نہیں کرتی' سنی سنائی باتوں پر یقین کر کے انہیں لے بھاگتی ہے۔'' (مکتوبِ پرویز بنام بیگم بلند اختر' مورخہ 6/9/79)۔

☆☆☆

''شیعہ اور سنی سب بعد کی پیداوار ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں نہ کوئی شیعہ تھا نہ سنی۔ سب مسلمان تھے۔ خدا نے ان کا نام ''مسلم'' رکھا تھا۔ اس کے رسولؐ نے بھی اپنے آپ کو مسلم ہی کہلوایا تھا۔ اس لئے ہمیں بھی ان کے بعد کے پیدا کردہ امتیازات سے بلند ہو کر مسلم ہی کہلوانا چاہئے۔'' (مکتوبِ پرویز بنام بیگم بلند اختر' مورخہ 6/9/79)۔

☆☆☆

''فرعون کی بیوی کو قرآن مجید نے مومن کہا ہے لیکن اس سے زیادہ کوئی تفصیل نہیں دی۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ صاحب ژند تھی اور فرعون اس کے عقائد میں دخل نہیں دیتا تھا۔ اس نے فرعون کی مرضی کے خلاف بنی اسرائیل کے ایک بچے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو گود میں بھی لے لیا تھا۔

اصل یہ ہے کہ قرآن نے آ کر انسانوں کے باہمی روابط کے لئے واضح احکامات دیے ہیں اور مشرکین کے ساتھ نکاح کو جائز قرار نہیں دیا۔ معلوم نہیں کہ فرعون کی بیوی کون سی شریعت کی پابند تھی۔ بہرحال ہمارے لئے تو قرآنی شریعت کی پابندی ضروری ہے۔'' (مکتوبِ پرویز بنام بیگم

بلند اختر' مورخہ 7/8/79)۔

☆☆☆

''ہمارے ہاں بچوں کے لئے کوئی' مفید کو چھوڑیئے معقول لٹریچر بھی نہیں۔ انگریزی زبان میں بچوں کے لئے لٹریچر تو ملتا ہے لیکن وہ انہی کے ہاں کے بچوں کے لئے مفید ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں تو اس سے اور الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔'' (مکتوبِ پرویز بنام بیگم بلند اختر' مورخہ 2/6/80)۔

☆☆☆

''آپ نے جس درس دینے والی خاتون کا ذکر کیا ہے تو میرا تجربہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی والے اپنا مسلک بدلنے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوتے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ یہ ہوتے ہیں ملا ہی لیکن ماڈرن کہلانے کی وجہ سے اپنے آپ کو باقی ملاؤں سے ممتاز سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ پھر ان میں سے اگر کوئی تقریر کرنے' خطبہ دینے یا درس دینے لگ جائے تو وہ خود اپنوں میں بھی امتیازی حیثیت حاصل کر لیتا ہے۔ اس حیثیت کو چھوڑنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ جس اَنا کو وہ دوسروں کو مارنے کے لئے کہتی ہے اس کا سارا کاروبار خود اس کی اپنی اَنا کے محور کے گرد گردش کرتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ اپنے درس دینے میں تو اس کا کچھ لگتا ہی نہیں۔ وہ سب اسے گویا حفظ یاد ہوتے ہیں اور جو قرآن آپ پیش کرتی ہیں اسے تو سمجھنے کے لئے ایک عمر درکار ہوگی چہ جائیکہ وہ فوراً درس دینے لگ جائے۔ بہر حال یہ میرا تجربہ ہے۔ آپ اپنے طور پر کوشس کر کے دیکھ لیں لیکن اس کی احتیاط برتیں کہ وہ جھگڑا نہ کھڑا کر دے۔ یہ ان کی خاص ٹیکنیک ہوتی ہے۔'' (مکتوبِ پرویز بنام بیگم بلند اختر' مورخہ 2/6/80)۔

☆☆☆

''کتاب مجھے مل گئی تھی۔ پیش گوئیوں کے متعلق بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر کسی پیش گوئی کے متعلق قرآن نے متعین طور پر کسی شخص کا نام لیا ہو یا کسی واقعہ کا ذکر کیا ہو اس کی بابت یقینی طور پر کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن جہاں قرآن نے محض اشارات سے کام لیا ہو وہاں محض قیاسات (Guess) سے کام لے سکتے ہیں اور قیاسات کے متعلق کبھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ یقینی ہیں۔ اگر ہم آج اپنے کسی قیاس کی رو سے کسی پیش گوئی کے متعلق متعین بات کر دیں اور کل کو وہ اس کے مطابق نہ نکلے تو لوگ یہی کہیں گے کہ قرآن کی پیش گوئی غلط ثابت ہوگئی۔ اس کتاب میں اسی طرح کے قیاسات سے کام لیا گیا ہے۔ ہمیں انہیں دنیا کے سامنے قرآنی پیش گوئیوں کے متعلق یقینی طور پر پیش نہیں کرنا چاہئے۔'' (مکتوبِ پرویز بنام بیگم بلند اختر' مورخہ 15/6/80)۔

☆☆☆

''بچوں کو قرآنی اقدار کے متعلق کچھ سمجھانے کا کام واقعی مشکل ہے۔ یہ بتایئے کہ اگر میں آسان سی اردو زبان میں کچھ ریکارڈ کر دوں تو کیا یہ بچے اسے سمجھ سکیں گے۔ میرا خیال ہے ان کی عمر ابھی بہت کم ہے۔ تھوڑے سے اور بڑے ہو جائیں تو وہ کچھ باتیں سمجھنے کے قابل ہو جائیں

گے۔'' (مکتوبِ پرویز بنام بیگم بلند اختر' مورخہ 15/6/80)۔

☆☆☆

''آپ نے اختلاف فکر ونظر کی بنا پر گھروں کی زندگی میں اختلافات پیدا ہونے کی شکایت کی ہے۔ مجھ سے زیادہ اس کا احساس کسے ہوسکتا ہے۔۔! میں تو کسی کو موہوم امیدیں دلانے کا قائل ہی نہیں۔

یہ مسئلہ کسی ایک گھر کا نہیں۔ کسی ایک جوڑے کا نہیں۔ اس کی حدود کافی حد تک وسیع ہیں اور اس کا علاج انفرادی نہیں' اجتماعی ہے۔ مکہ کی مومن عورتیں جو کفار کی بیویاں تھیں اس وقت مکہ چھوڑ کر مدینہ آئیں جب مدینہ میں اسلامی نظام قائم ہوگیا تھا۔ اس سے پہلے انہیں ان گھریلو تصادمات کو برداشت کرنا ہی پڑا اور ان تصادمات کی شدت کا تو ہم اندازہ بھی نہیں کرسکتے۔'' (مکتوبِ پرویز بنام بیگم بلند اختر' مورخہ 17/8/80)۔

☆☆☆

''میں نے زندگی کے مختلف حصوں میں لٹریچر کی مختلف اصناف سب پڑھ ڈالی تھیں۔ اس سلسلے میں Dickens کے ناول بھی دیکھ ڈالے تھے۔ ان میں David Copperfield مجھے بھی خاص طور پر پسند تھا۔ اس کا انداز بڑا موثر ہوتا ہے۔'' (مکتوبِ پرویز بنام بیگم بلند اختر' مورخہ 3/8/81)۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ع ب د

عبد۔ دراصل ایک خوشبودار پودے کو کہتے ہیں جو اونٹوں کے لئے بڑی کشش رکھتا ہے۔ اس کے کھانے سے اونٹ فربہ ہو جاتے ہیں اور ان کا دودھ بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ خاصیت کے اعتبار سے اس پودے کا مزاج گرم ہوتا ہے اس لئے جب اونٹ اسے کھاتے ہیں تو وہ پیاسے ہو جاتے ہیں اور پانی مانگتے ہیں۔ اس اعتبار سے اس پودے میں تین خصوصیتیں ہیں۔ (۱) کشش و جاذبیت۔ (۲) ابتداءً پیاس کی تکلیف لیکن آخرالامر (۳) فربہی اور دودھ کی فراوانی۔ لہٰذا اس کے بنیادی معنوں میں ابتداءً تکلیف لیکن آخرالامر نفع بخشی کے پہلو مضمر ہیں۔ اسی بنیادی معنی کے پیش نظر عرب، کشتی پر تیل یا چربی یا تارکول ملتے تھے تو اس سے کشتی بدصورت ہو جاتی تھی لیکن نتیجہ کے اعتبار سے اس کی لکڑی پانی کے اثرات سے محفوظ ہو جاتی تھی۔ اسی لئے ایسی کشتی کو **سفینۃ معبدۃ** کہتے تھے (تاج)۔ ابن فارس نے اس کے بنیادی معنوں میں دونوں باتوں کو شامل کیا ہے۔ یعنی نرمی و ذلت اور سختی و غلظت۔ (یعنی اس طرح کی نرمی کہ جس سے درحقیقت سختی آتی جائے) اس بنیادی مفہوم کے اعتبار سے **عبادۃ** کے معنی ایسا کام کرنا ہیں جو دل کے شوق اور رغبت سے سرانجام دیا جائے (کیونکہ **عبد** پودا اپنی خوشبو کی وجہ سے اپنے اندر خاص کشش رکھتا ہے) اور وہ نتائج کے لحاظ سے نہایت منفعت بخش ہو اگرچہ اس کے لئے تھوڑی سی مشقت بھی برداشت کرنی پڑے۔ **لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا** (۲/۲۸۶) عبادت کے اس مفہوم کو واضح کر رہا ہے۔ یعنی انسان، قوانین خداوندی کی اطاعت سے جو پابندیاں اپنے اوپر عائد کرتا ہے، بظاہر ان میں مشقت اور تکلیف ہوتی ہے لیکن درحقیقت وہ نفس انسانی کی وسعت اور کشود کے لئے ہوتی ہیں۔

قرآن کریم نے عبادت کے اس مفہوم کو تین آیتوں میں واضح کر دیا ہے۔ اس نے پہلے کہا کہ **وذکر فان الذکریٰ تنفع المؤمنین** (۵۱/۵۵)۔ ان کے سامنے خدا کا ضابطۂ قانون (واضح طور پر) پیش کرتا رہ کیونکہ یہ ان کے لئے نہایت منفعت بخش ثابت ہوگا۔ اس کے بعد بتایا کہ وہ منفعت بخش اصول حیات کیا ہے۔ **وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون**

(۵۱/۵۶)۔ ان سے کہہ دے کہ ہم نے تمام انسانوں کو' خواہ وہ حضری ہوں یا بدوی (جن وانس کے معانی کے لئے ان الفاظ کو اپنے اپنے مقام پر دیکھئے)' اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔ یہ وہ کام ہیں جن میں ابتداءً مشقت اٹھانی پڑے گی (اس لئے کہ **السابقون الاولون** کو ہمیشہ مشقت اٹھانی پڑتی ہے) لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ یہ مشقت اس لئے ہے کہ تم محنت کرو اور ہم تمہاری محنت کی کمائی کھائیں۔ بالکل نہیں۔ **ما ارید منھم من رزق وما ارید ان یطعمون** (۵۱/۵۷)۔ ہم ان سے رزق نہیں چاہتے۔ یعنی ہم یہ نہیں چاہتے کہ یہ کمائیں اور ہم کھائیں۔ ان کی یہ مشقت خود انہی کے فائدے کے لئے ہے **〈تنفع المؤمنین〉**۔ آپ پہلے پہل جو پابندی بھی اپنے اوپر عائد کریں گے اس سے آپ کو اپنے سابقہ معمول سے ہٹنا پڑے گا اور یہ گراں گذرے گا۔ لیکن اس کے بعد جب اس پابندی کی نفع رسانیاں آپ کے سامنے آئیں گی تو وہ عین راحت بن جائیں گی۔

''مشقت اور منفعت'' کے دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھ کر **عبد** کے معنی سمجھئے۔ **تعبید** کے معنی ہیں اونٹ (یا گھوڑے) کو سدھا کر جوتنے کے قابل بنا دینا (لین وتاج) (اسے انگریزی میں Breaking یا Harnessing) کہتے ہیں۔ یعنی اس جانور کا اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو اس پروگرام کی تکمیل کے لئے صرف کرنا جو اس کے لئے متعین کیا گیا ہو۔ اسی طرح سڑک کو کوٹ کر ہموار کر دینا تا کہ لوگ اس پر آسانی سے چل سکیں' یہی **تعبید** کہلاتا ہے (لین وتاج)۔ آپ دیکھئے کہ ان کاموں میں ابتداءً کس قدر محنت اور مشقت درکار ہوتی ہے لیکن آخرالامر ان کا نتیجہ کس قدر منفعت بخش ہوتا ہے۔ قانون کے مطابق زندگی بسر کرنے میں بھی یہی ہوتا ہے۔

لہٰذا عبادت کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو (سرکش و بے باک رکھنے کے بجائے) قوانین خداوندی کے قالب میں ڈھال کر ایک سدھائے ہوئے گھوڑے کی طرح منشائے خداوندی کے مطابق صرف کرے جس کا نتیجہ منفعت عامہ ہوگا۔ چنانچہ قرآن کریم نے **اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت** (۱۶/۳۶) سے اس مفہوم کو واضح کر دیا۔ **طاغوت** (اس کے معنی (ط۔غ۔ی) کے تحت دیکھئے) کے معنی ہیں سرکش قوتیں۔ لہٰذا آیت کے معنی یہ ہیں کہ اپنی قوتوں کو سرکش و بے باک رکھنے کی بجائے' یا سرکش قوتوں کے منشاء کے مطابق صرف کرنے کے بجائے' قوانین خداوندی کے تابع رکھ کر صرف کرو۔ دوسری جگہ ہے **لاتعبد الشیطٰن** (۱۹/۴۴)۔ اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ سرکش قوتوں کی اطاعت مت کرو (اس کے معنی یہ نہیں کہ شیطان کی پرستش مت کرو۔ دنیا میں شیطان کی پرستش کوئی بھی نہیں کرتا۔ عراق میں (موصل کے قریب) ایک باطنی فرقہ (یزیدی) کے متعلق مشہور ہے کہ وہ شیطان کی پرستش کرتے ہیں۔ لیکن ایک انگریز خاتون نے ان لوگوں کے کوائف ومعتقدات کا ذاتی طور پر مطالعہ کر کے (''ملک طاؤس'' کے نام سے) ایک کتاب شائع کی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ شیطان کی پرستش نہیں کرتے بلکہ اس سے ڈرتے بہت ہیں اور اس وجہ سے اس کے خلاف کچھ نہیں کہتے۔) ''شیطان'' کا یہ مفہوم آیت

کے اگلے ٹکڑے نے واضح کر دیا کہ **ان الشیطن کان للرحمن عصیا** (۱۶/۴۴) کیونکہ شیطان خدا کے قوانین و احکام سے سرکشی اختیار کئے ہوئے ہے۔ اس میں خارجی قوتوں کے علاوہ انسان کے اپنے جذبات بھی آ جاتے ہیں جو قانون خداوندی سے سرکشی برتیں (دیکھئے عنوان ش۔ ط۔ ن)۔ نیز قرآن کریم کی وہ آیات جن میں کہا گیا ہے کہ **افرأیت من اتخذ الٰھه ھوہ** (۴۵/۲۳) کیا تو نے اسے بھی دیکھا جس نے اپنے جذبات ہی کو اپنا الٰہ بنا لیا؟ ۔ سورۃ نحل کی مندرجہ بالا آیت (۱۶/۳۶) یوں ہے۔ **ولقد بعثنا فی کل امة رسولا ان اعبدوا اللہ و اجتنبوا الطاغوت** ۔ یعنی خدا کی طرف سے جو رسول بھی آتا تھا وہ یہی پیغام لاتا تھا کہ ''اللہ کی عبودیت اختیار کرو اور طاغوت سے اجتناب کرو''۔ اس تقابل سے ''اللہ کی عبودیت'' کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ دوسری جگہ ہے کہ ذرا ان لوگوں کا حال دیکھو جو اپنے ذہن میں یہ سمجھتے ہیں کہ وہ قرآن پر اور کتب سابقہ پر ایمان رکھتے ہیں **و یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت وقد امروا ان یکفروا به** (۴/۶۰)۔ اور چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کے فیصلے غیر خدائی قوانین کی رو سے کرائیں' حالانکہ انہیں حکم دے دیا گیا ہے کہ وہ غیر خدائی قوتوں سے اجتناب کریں (۲/۲۵۷)۔ اس سے ظاہر ہے کہ طاغوت سے اجتناب کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے معاملات کے فیصلے نہ تو اپنے ذاتی جذبات وخیالات کے مطابق کرے اور نہ ہی غیر خدائی قوانین کے مطابق کرائے' بلکہ ان کے فیصلے قوانین خداوندی کے مطابق کرائے۔ اسی کو **اعبدوا اللہ** کہا گیا ہے۔ یعنی خدا کی عبودیت اختیار کرنا۔ یہ ہے عبادت کا قرآنی مفہوم۔

قرآن کریم نے ''خدا کی عبادت'' کی اصطلاح ٹھیک ان معنوں میں استعمال کی ہے جن معنوں میں آج کل ''حکومت'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ سورۃ کہف میں ایک جگہ ہے کہ **ولا یشرک بعبادۃ ربه احدا** (۱۸/۱۱۰)۔ ''ان کو چاہئے کہ وہ اپنے رب کی ''عبادت'' میں کسی کو شریک نہ کریں'' اور دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کے متعلق ہے کہ **ولا یشرک فی حکمه احدا** (۱۸/۲۶)۔ ''وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا''۔ اسی طرح سورۃ یوسف میں پہلے کہا گیا کہ **ان الحکم الا للہ** (۱۲/۴۰)۔ ''حکومت اللہ کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی''۔ اور اس کے بعد کہا'' **امر الا تعبدوا الا ایاہ** (۱۲/۴۰)۔ ''اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبودیت (محکومیت) اختیار نہ کرو''۔ آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم کس طرح ''حکومت'' اور ''عبادت'' کے الفاظ مرادف معانی میں استعمال کرتا ہے۔ قصۂ حضرت موسیٰ علیہ السلام میں ہے کہ آپ نے فرعون سے کہا کہ تم اپنے جو احسانات جتا رہے ہو' تو وہ ان کے سوا کیا ہیں **ان عبدت بنی اسرائیل** (۲۶/۲۲) کہ تم نے بنی اسرائیل کو اپنا محکوم بنا رکھا ہے! اسی طرح قوم فرعون کا یہ قول قرآن کریم نے نقل کیا ہے کہ (انہوں نے کہا کہ) کیا ہم ان دو

(بھائیوں) کی بات مان لیں جو ہمارے جیسے انسان ہیں۔ **و قومھما لنا عابدون** (۲۳/۴۷)۔ اوران کی قوم ہماری محکوم ہے۔ ان معاملات میں بھی یہ مادہ' حکومت کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ قرآن کریم کا مقصود یہ ہے کہ انسان صرف قوانین خداوندی کی محکومی اختیار کرے۔ کافر اور مومن میں یہی فرق ہے۔ اس کا واضح ارشاد ہے کہ **ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولٰئک ھم الکافرون** (۵/۴۴)۔ جو قوم قرآن کریم کے مطابق حکومت نہیں کرتی' تو یہی لوگ کافر ہیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ جماعت مومنین کو حکومت اسی لئے دی جائے گی کہ (۱) ان کے دین کا تمکن ہو سکے (۲) یہ خدا کی ''عبادت'' کر سکیں **〈یعبدوننی〉**۔ اور (۳) اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں **〈لا یشرکون بی شیئا** ۲۴/۵۵)۔ ظاہر ہے کہ اگر ''عبادت'' سے مراد محض پرستش ہو تو اس کے لئے اپنی حکومت کا ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ پرستش تو ہر حکومت میں ہو سکتی ہے۔ ہمیں انگریز کی غلامی کے زمانے میں بھی ''خدا کی پرستش'' کی پوری پوری آزادی حاصل تھی۔ لہٰذا ''اللہ کی عبادت'' سے مفہوم اس کے احکام کی محکومیت اختیار کرنا ہے۔ یعنی قرآن کریم کے مطابق حکومت قائم کرنا۔

ظالم اور جابر بادشاہوں اور سرداروں کے خلاف جنگ کر کے ان کی مظلوم رعایا کو اپنی حفاظت میں لے لیا جاتا تھا تو ان کی پناہ میں آئے ہوئے لوگوں کو **عبید** کہتے تھے (اس لئے کہ ان لوگوں کو مستبد حاکموں کے پنجۂ استبداد سے چھڑانے کے لئے سخت مشقت اٹھانی پڑتی تھی لیکن یہ چیز آخر الامر ان مظلوموں کے لئے بڑی منفعت بخش ثابت ہوتی تھی۔ **عبید** اور **عباد**۔ **عبد** کی جمع ہیں۔ **عابد** کی جمع **عابدون** اور **عبدۃ** ہیں)۔ پناہ دینے کا یہ جذبہ زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا اور اس طرح ہاتھ میں آئے ہوئے مظلوموں کو لوگ غلام بنانے لگ گئے۔ اب انہی کو **عبد** اور **عبید** کہنے لگے۔ یوں اس لفظ میں غلامی اور محکومی کے معنی پیدا ہو گئے (تاج)۔ چنانچہ قرآن کریم میں **عابد** کے معنی محکوم (۲۳/۴۷)۔ **عبد** کے معنی محکوم بنانا (۲۶/۲۲) اور **عبد** کے معنی غلام (۲/۱۷۸) واضح ہیں۔ اس سے اس لفظ میں اطاعت شعاری کا مفہوم آ گیا ہے۔ چنانچہ اب **تعبد** اور **تذلل** ہم معنی استعمال ہوتے ہیں۔ (یعنی مطیع و منقاد ہو جانا' قانون کے سامنے جھک جانا)۔ **تعبد وتذلل** کا یہی جذبہ' پرستش کے اندر کارفرما ہوتا ہے۔ اس سے **عبادۃ** کے معنی پرستش ہو گئے۔ قرآن کریم میں ہے **قالوا نعبد اصناما**۔ (۲۶/۷۱)۔ انہوں نے کہا' ہم بتوں کی پرستش کرتے ہیں۔ یہ بت درحقیقت مظاہر ہوتے ہیں ان معبودوں کے جو ان لوگوں کے ذہن میں مجرد شکل (Abstract Form) میں موجود ہوتے ہیں اور جن کے متعلق ان کا عقیدہ ہے کہ وہ انہیں نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ لہٰذا وہ ان کے سامنے طمع یا خوف (جلب منفعت یا دفع مضرت) کے خیال سے جھکتے ہیں۔ یہی بنیاد کسی کی محکومی اختیار کرنے کے لئے بھی ہوتی ہے۔

ابتدائی مشقت کے پیش نظر اسی مادہ سے **عبد**

یعبد آتا ہے جس کے معنی نفرت یا بیزاری کا اظہار کرنا ہے (تاج ولین نیز کتاب الاشتقاق)۔ چنانچہ سورۃ زخرف میں ہے **قل ان کان للرحمن ولدا فانا اول العٰبدین** (۴۳/۸۱)۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ان سے کہہ دو کہ اگر کوئی رحمان ایسا ہوسکتا ہے جس کے یہاں اولاد بھی ہوتی ہو تو میں سب سے پہلا شخص ہوں گا جو اس قسم کے رحمٰن سے نفرت و بیزاری کا اظہار کر دے (ابن قتیبہ (القرطین ج/۲ صفحہ ۱۲۵)۔ (ایسے رحمٰن کو دور ہی سے سلام ہے)۔ واضح رہے کہ اگر **عابدین** کو **عبد۔ یعبد** ہی سے فاعل مانا جائے تو اس کے معنی فرماں بردار کے ہوں گے۔ اس شکل میں اس جملہ شرطیہ کا مفہوم یہ ہوگا کہ اگر رحمٰن کا کوئی بیٹا ہوسکتا ہے تو میں سب سے پہلے اس کا فرمان بردار ہوں، لیکن چونکہ اس کا کوئی بیٹا ہو ہی نہیں سکتا اس لئے اس بیٹے کے فرماں بردار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

العبد کے پہلے معنی انسان کے ہیں خواہ وہ آزاد ہو یا غلام۔ پھر زیادہ تر یہ غلام کے لئے استعمال ہونے لگا (تاج)۔

لہٰذا قرآن کریم میں

(۱) جہاں اللہ کی عبادت کا ذکر ہوگا اس کے معنی ہوں گے قوانین خداوندی کی برضا و رغبت اطاعت جس سے نہایت منفعت بخش نتائج مرتب ہوں گے۔ چونکہ جذبات اطاعت و فرماں پذیری کے اظہار کے لئے کوئی محسوس انداز اختیار کرنا۔ (مثلاً جھکنا) انسان کے لاشعور میں چلا آرہا ہے اس لئے قرآن کریم نے بھی اظہار جذبات کے اس محسوس انداز کا لحاظ رکھا ہے۔ لیکن اس نے اسے بھی ایک اجتماعی حیثیت دے دی ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے **صلوٰۃ** جو ص۔ ل۔ و کے عنوان کے ماتحت درج ہے)۔ یعنی خدا کے سامنے جھکنا (رکوع و سجود) اس حقیقت کا محسوس مظاہرہ ہے کہ ہم قوانین خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ ہم ان کی اطاعت اور فرماں پذیری کو قبول کرتے ہیں۔ سورۃ بقرہ میں دیکھئے **اسلمت** اور **نعبد** مرادف معانی میں استعمال ہوئے ہیں۔ اسی کو **الدین** کہا گیا ہے (۳۳-۱۳۱/۲)۔ نیز **مسلمون** اور **عابدون** اور **مخلصون** بھی (۳۸/۱۳۶/۲)۔

(۲) جہاں طاغوت اور شیطان کی عبادت کا ذکر ہوگا اس سے مفہوم یا تو انسان کے خود اپنے جذبات کی اطاعت ہوگی یا دوسرے انسانوں کے احکام کی اطاعت۔ ان میں مستبد حکمرانوں کی محکومیت اور مذہبی پیشواؤں کی عقیدتمندانہ اطاعت بھی شامل ہوگی۔ اس کے مقابلہ میں ''خدا کی عبادت'' سے مراد ہوگی اس کے قوانین کی اطاعت۔ خدا کی محکومیت۔

(۳) جہاں بتوں یا دیوی دیوتاؤں کی عبادت کا ذکر ہو گا وہاں ان کی توہم پرستانہ پرستش مفہوم ہوگا۔ ان کی پرستش کا جذبۂ محرکہ بھی وہی ہوتا ہے جو بادشاہوں کے سامنے جھکنے کا ہوتا ہے۔

(۴) **عباد الرحمن** کے معنی ہوں گے وہ لوگ جو صرف قوانین خداوندی کی اطاعت کریں۔ جو اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو اس راستہ (Channel) پر ڈال

دیں جو اس کے قانون نے متعین کیا ہے۔ اسی سے **ایاک نعبد** (۱/۴) کا مفہوم واضح ہے۔ یعنی ہم صرف تیرے قوانین کے سامنے جھکتے ہیں۔ ہم صرف تیری محکومیت اختیار کرتے ہیں۔ ہم اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو (ایک سدھے ہوئے گھوڑے کی طرح) اس مقصد کے حصول کے لئے صرف کرتے ہیں جو تو نے ہمارے لئے مقرر کیا ہے۔

اجتماعات صلوٰۃ میں اٹھنا اور جھکنا انہی جذبات اطاعت و فرماں پذیری کا محسوس مظہر ہے۔ لیکن خدا کی عبادت اسی حد تک محدود نہیں۔ اس کی عبادت سے مقصود یہ ہے کہ انسان، زندگی کے ہر سانس میں قوانین خداوندی کی اطاعت کرے۔ **وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون** (۵۱/۵۶) سے یہی مقصود ہے۔

اتنا اور واضح کر دینا ضروری ہے کہ ''قوانین خداوندی کی محکومیت'' اختیار کرنے سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان کو اس دنیا میں جنت کی خوشگواریوں کی زندگی نصیب ہو جائے اور اس کی ذات کی ایسی نشوونما ہو جائے جس سے یہ مرنے کے بعد، زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو سکے۔ یہ ''محکومی'' درحقیقت، زندگی کی بلند، مستقل، اقدار کو از خود اپنے اوپر عائد کرنا ہوتا ہے۔ یہ (Self-Imposed Restrictions) ہوتی ہیں۔ کسی کی خارج سے عائد کردہ پابندیاں نہیں ہوتیں۔ نہ ہی اس میں (Worship) کا وہ مفہوم ہوتا ہے جسے زمانہ قدیم کے انسان نے، فطرت کی قوتوں سے ڈر کر، انہیں خوش کرنے کے لئے، اپنے ذہن سے وضع کیا تھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک (المائدہ ۶۷)

اے رسول ﷺ! اس ضابطہ حیات کو جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے تمام انسانوں تک پہنچا دو۔

جمال حسین شاہ، ایبٹ آباد

قرآنی نظام یا جمہوری نظام

ہماری بلکہ پوری انسانیت کی پریشانیوں کا واحد حل صرف قرآنی نظام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نوع انسان کی ہدایت (راہنمائی) کے لئے قرآن کریم نازل فرمایا ہے جو مکمل ضابطہ حیات ہے۔ ذلک الکتب لا ریب فیہ ھدی للمتقین (بقرہ۲)۔ یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں، راہ بتلانے والی ہے اللہ سے ڈرنے والوں کو۔ قرآن کریم مفصل کتاب ہے۔ انزل الیکم الکتب مفصلا (الانعام۱۱۴) ہدایت (راہنمائی) کبھی ادھوری نہیں ہوسکتی۔ مسلمان ہزار برس سے قرآن کریم پر عمل کرنے کی بجائے قرآن کریم کے لفظ دوہرائے جا رہے ہیں۔ کیا قرآن کریم کے علاوہ دنیا میں اور بھی کوئی کتاب ہے جس کو بغیر سمجھے پڑھا جاتا ہو۔ قرآن کریم کو ہم ثواب کی نیت سے پڑھ رہے ہیں اور عمل انسانوں کے بنائے ہوئے قانون پر کر رہے ہیں۔ جب تک ہم قرآن کریم کے مطابق فیصلے نہیں کریں گے ہم مسلمان ہی نہیں ہو سکتے ذرا قرآن کریم کی ان آیات پر غور فرمائیں۔

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فائولک ھم الکٰفرون (المائدہ۴۴)

جو قرآن کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولٰک ھم الظٰلمون (المائدہ۴۵)

جو قرآن کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ ظالم ہیں۔

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولٰک ھم الفٰسقون (المائدہ۴۷)

جو قرآن کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ فاسق ہیں۔

سوچیں رسول اللہ ﷺ کس کے مطابق فیصلہ کرتے تھے اور ہم کس کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں۔ ہمارا کون سا فیصلہ قرآن کریم کے مطابق ہوتا ہے۔ قرآن کریم کا استعمال تو ہم مُردوں کو ثواب پہنچانے کے لئے کر رہے ہیں اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اب ہمارے معاشرے میں انصاف نام کی کوئی چیز

نہیں، مساوات نہیں کسی کی جان محفوظ نہیں، کسی کی عزت محفوظ نہیں، بھائی کو بھائی پر اعتماد نہیں، اس معاشرے کا دین اسلام سے کیا تعلق ہے؟ قرآن کریم ہمیں آواز دے رہا ہے کہ

افلا یتدبرون القران ام علی قلوب اقفالھا (محمد ۲۴)

کیا تم لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے تمہارے دلوں پر قفل (تالے) لگے ہوئے ہیں۔

اس وقت کفار پوری طرح ہم پر غالب ہیں جبکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے۔ وانتم الاعلون ان کنتم مومنین۔ (آل عمران ۱۳۹) اور غالب تم ہی رہو گے اگر تم مومن ہو۔ کافر کبھی مومن پر غالب نہیں آ سکتے صرف یہ کسوٹی ہے اپنے ایمان کو پرکھنے کی اگر ہم مومن ہوتے تو اللہ کا وعدہ تھا کہ کفار ہم پر غالب نہیں آ سکتے تھے اور مومن بننے کے لئے صرف احکام الٰہی کی پابندی کرنی پڑتی ہے یعنی قرآن کریم کے مطابق اپنی زندگی بسر کرنے سے نہ کہ قرآن کے لفظ دہرانے سے۔ قرآن کریم دو ہی گروہوں کی بات کرتا ہے مومن اور کافر، حق اور باطل، روشنی اور اندھیرا، جنت اور جہنم اپنا جائزہ لیں ہم کس گروپ میں آتے ہیں اس وقت مسلمان ذلت اور رسوائی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور جو دنیا میں ذلت کی زندگی گذارے گا آخرت میں جنت کو جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اگر آپ پھر سے کفار پر غالب آنا چاہتے ہیں تو خالص قرآنی زندگی کو اپنائیں آپ کے ہر معاملے میں اللہ کا حکم ہونا چاہئے۔ صدیوں سے فرقوں میں بٹے ہوئے مسلمان قرآنی آیات سے چشم پوشی کر رہے ہیں۔ کیا ان فرقوں کا حضور ﷺ سے کوئی تعلق ہے ارشاد ربانی ہے:

ان الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعا لست منھم فی شیء (الانعام ۱۵۹)

اے رسول ﷺ! بے شک جن لوگوں نے اپنے دین میں فرقے بنا لئے آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا (آل عمران ۱۰۳)

اور اللہ کی رسی (قرآن) کو مضبوطی سے پکڑو اور تفرقہ مت کرو۔

صرف اور صرف قرآن کریم پر ہی عمل کرنے سے فرقے ختم ہو سکتے ہیں قرآن کریم میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں۔ حضور ﷺ نے قرآن کریم کے مطابق زندگی گزاری ہے اور قرآن کریم کا ایک ایک لفظ اپنی اصلی شکل میں آپ کے پاس موجود ہے آج بھی اگر آپ قرآن کریم والی زندگی گزاریں تو سو فیصد حضور ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی زندگی آپ زندگیوں میں آ جائے گی چودہ سو سال پہلے حضور ﷺ نے اپنی جماعت سے مل کر قرآنی نظام قائم کیا تھا۔ حضور ﷺ نے مدینہ میں ایک ایسی فلاحی مملکت قائم کی تھی جس کی مثال دنیا نے نہ پہلے کبھی دیکھی ہے نہ بعد میں۔ اس مملکت کا دستور (آئین) قرآن کریم تھا اور قرآنی احکام پر عمل درآمد امت کے اولی الالباب کے مشورے سے کیا جاتا تھا۔

حضورﷺ نے وحی خداوندی (قرآن) کے عین مطابق یہ نظام قائم کیا تھا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وان احکم بینھم بما انزل اللہ (المائدہ ۴۹) ان میں کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم کرو۔

قرآن کریم کا نظام انسانی معاشرے کو بھی صحیح خطوط پر قائم رکھتا ہے اور انسانی ذات کو ارتقاء اور شرف انسانیت کی منازل طے کراتا ہوا اس زندگی سے ارفع و اعلیٰ زندگی بسر کرنے کی صلاحیت بھی عطا کرتا ہے۔ صحیح راستہ صرف ایک ہی ہوتا ہے۔ وہ ہے قرآن کریم کا راستہ۔ یاد رکھیں دنیا میں قرآنی نظام کے سوا کوئی نظام کامیاب نہیں ہو سکتا۔ جمہوری نظام قرآنی نظام کی ضد ہے۔ جمہوریت میں اکثریتی رائے قانون ہے۔ اگر سو میں سے اکیاون (۵۱) آدمی شراب کو جائز کہیں تو وہ جمہوریت میں قانوناً جائز ہو جائے گی جب کہ قرآنی نظام میں اول تو نصِ صریح کے خلاف رائے لی ہی نہیں جائے گی اور اگر سو فیصد بھی شراب کو جائز کہیں تو پھر بھی جائز نہیں ہوگی۔ جمہوریت کیا ہے امیر سے امیر تر اور غریب سے غریب تر۔ دنیا میں اس وقت جمہوری نظام کا ہی کرشمہ ہے کہ آج انسان انسان کا شکاری بن گیا ہے اس وقت پوری انسانیت جمہوری نظام کی بدولت تباہی کے کنارے پر پریشان کھڑی ہے۔ انتہائی افسوس کی بات ہے کہ ہمارے علماء کرام بھی پاکستان میں مغربی جمہوری نظام کی بحالی و قیام کے لئے سرگرم ہیں۔ جو خالص غیر مسلموں کا نظام ہے جبکہ پاکستان حاصل ہی قرآنی نظام کے لئے کیا گیا تھا۔ تنہا انسان کی عقل اپنے لئے کوئی نظام ایسا نہیں لاسکتی جو اس کو حقیقی امن وسکون دے سکے۔ عقل کو وحی کی اسی طرح ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو روشنی کی۔ قرآن کریم پوری انسانیت کو ایک امت قرار دیتا ہے کان الناس امة واحدة (بقرہ ۲۱۳)۔ اور ہر انسان کو قابل عزت قرار دیتا ہے ولقد کرمنا بنی ادم۔ (بنی اسرائیل ۷۰)۔ جب تک آپ قرآنی نظام قائم نہیں کریں گے آپ دنیا سے پریشانیوں کو ختم نہیں کر سکتے۔ جتنا جلدی آپ قرآن کریم کو عملی طور پر اپنی زندگی میں لے کر آئیں گے اتنی جلدی اس دلدل سے نکل جائیں گے۔ اس بات کو آپ آج مان لیں یا سو سال بعد مانیں بات یہ ہی حق ہے کہ انسانیت کی پریشانیوں کا واحد حل قرآن کریم پر عمل کرنا ہے۔ جمہوری نظام پوری طرح ناکام ہو چکا ہے اس سے پہلے کہ دنیا کوئی اور نظام اپنا کر مزید رسوا ہو اس کے سامنے قرآنی نظام پیش کر دیں اگر آپ قرآنی نظام کی ایک کونپل بھی نکالنے میں کامیاب ہو گئے تو دنیا بغیر تبلیغ کے اس نظام میں فوراً شامل ہو جائے گی۔ دنیا قرآنی نظام کے لئے تڑپ رہی ہے اور مسلمانوں نے قرآن کو تعویذ دھاگوں کی کتاب بنایا ہوا ہے۔ آپ دنیا کے باطل نظام سے نہ گھبرائیں حق آنے کی دیر ہے باطل بھاگ جائے گا۔ آپ قرآنی تعلیم عام کرتے جائیں، قرآن روشنی ہے، روشنی آنے سے اندھیرا خودبخود بھاگ جاتا ہے۔ قرآن اندھیروں میں سے روشنی کی طرف لے جاتا ہے ارشاد خداوندی ہے۔ کتٰب

انزلنه الیک لتخرج الناس من الظلمٰت الی النور (ابراہیم۔۱)۔ یہ قرآن ہم نے اس لئے نازل کیا ہے تا کہ آپ لوگوں کو اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لے جائیں۔ جماعت مومنین جس طرف بھی بڑھتی ہے باطل نظریات اس کے سامنے خش و خاشاک کی طرح بہہ جاتے ہیں۔ چند ہزار نوجوان بھی قرآنی نظام کو لے کر آگے بڑھیں تو ان کا راستہ کوئی نہیں روک سکے گا۔ جب تک ہم اپنی سوچ نہیں بدلیں گے۔ حالات کبھی نہیں بدلیں گے ہمارے معاشرے کی بدقسمتی یہ ہے کہ انہوں نے سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ دنیا میں سب سے بڑی بدبختی جہالت ہے اور بدقسمتی سے اس وقت جہالت مسلمانوں سے لپٹی ہوئی ہے۔ بڑے خوش نصیب لوگ ہوں گے جو اس پیغام کو سمجھ جائیں گے۔ قرآنی نظام کے لئے کوشش کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس نظام میں پوری انسانیت کی فلاح ہے۔ اس وقت مسلمان قرآنی نظام کو چھوڑ کر جہنم کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ہر گھر ہر خاندان میں پریشانی ہے، ہر دل کو آگ نے لپیٹا ہوا ہے۔ دلوں میں مرض بڑھ گیا ہے اور دلوں کے مرض کی شفا صرف قرآن شریف پر عمل کرنا ہے۔ قرآن شریف میں ارشاد ہے۔ وشفاء لما فی الصدور (یونس ۵۷)۔ اور قرآن دلوں کے مرض کی شفا ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم غیر قرآنی تصور چھوڑ کر خالص قرآن کریم پر عمل کریں قیامت کو صرف اسی بات کے بارے میں سوال ہوگا جو قرآن میں موجود ہے۔ کسی عقیدے کے صحیح ہونے کے لئے یہ دلیل کس قدر غلط ہے کہ وہ اسلاف سے وراثتاً منتقل ہو کر آیا ہے۔ اگر تپ دق کے جراثیم جو انسان کو اپنے اجداد سے وراثتاً ملے ہوں وہ اس قابل ہیں کہ جس قدر جلد ہو سکے انہیں فنا کر دیا جائے تو غلط عقائد کے جراثیم ایسے مقدس کیوں تصور کر لئے جائیں کہ ان کی پرورش خون قلب و جگر سے کی جائے۔ کس قدر افسوس اور شرمندگی کی بات ہے کہ قرآن کریم کی حامل قوم پستی اور ذلت کی زندگی گزار رہی ہے۔ قرآن کریم کو اگر آپ اللہ کی طرف سے ہدایت مانتے ہیں تو پھر ہدایت پر عمل کیا جاتا ہے نہ کہ طوطے کی طرح لفظ دوہرائے جاتے ہیں۔ ہمارا مسلک یہ ہے کہ مسلمانوں بلکہ نوع انسان کی انفرادی اور اجتماعی مشکلات کا واحد حل اور مصائب و آلام کا حتمی علاج صرف قرآن کریم پر عمل کرنا ہے ہمارا یہ عقیدہ محض خوش فہمی نہیں بلکہ ہمیں اس پر اس طرح یقین ہے۔ جس طرح آگ میں ہاتھ ڈالنے سے جل جانے کا یقین ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بعد ہمارے لئے ساری کائنات میں حضور ﷺ کی محبت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں اور محبت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ ﷺ کے مشن کو آگے بڑھایا جائے اور قرآن کریم پر عمل کیا جائے۔ تمام انبیاء کرامؑ آتے ہی احکام الٰہی پر عمل کروانے کے لئے ہیں۔ قیامت کے دن حضور ﷺ یہ گواہی دیں گے وقال الرسول یرب ان قومی اتخذوا ھذا القران مھجورا (الفرقان ۳۰)۔ حضور ﷺ کہیں گے اے اللہ یہ ہے میری قوم جس نے قرآن کو چھوڑ رکھا تھا۔

یعنی میری قوم نے اس قرآن کو ناقابل عمل سمجھ کر پس پشت ڈال رکھا تھا اور اپنی خودساختہ شریعتوں میں جکڑ رکھا تھا اور قرآن کو مُردوں کے پیچھے ثواب کے لئے پڑھتے تھے۔ قرآن ہی کے ساتھ منسلک رہنے سے دین قائم رہتا ہے اور اس کو چھوڑ دینے سے دامنِ دین ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ یہ آپ کی ذمہ داری ہے کہ آپ قرآنی نظام کے لئے کوشش کریں اس پیغام کو دوسروں تک پہنچائیں تاکہ قرآنی ذہن پیدا ہوسکیں۔ حق بات کبھی ضائع نہیں ہوتی۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

(اقبالؒ)

قرآنی نظام میں کیا ہوگا:

(۱) قرآنی معاشرہ میں ہر شخص کی عزت بلاتمیز قوم، رنگ، نسل، پیشہ محض اس کے انسان ہونے کی جہت سے ہو گی۔

(۲) کوئی شخص بے کس ولاچار، بے یارومددگار نہیں ہو گا۔ ہرایک کی بات سنی جائے گی۔ انصاف ہرایک کو ملے گا۔

(۳) کوئی فرد بھوکا، ننگا، بے گھر نہیں رہے گا تمام افراد کے لئے خوراک، لباس اور مکان کا انتظام قرآنی معاشرے کے ذمے ہوگا۔

(۴) قرآنی معاشرہ ہر شخص کی تعلیم وتربیت کا ذمہ دار ہوگا تاکہ انسانی ذات کی صلاحیتوں کی نشوونما ہوسکے۔

(۵) ہر شخص اپنی پوری صلاحیت سے کام کرے گا اپنی ضرورت کے مطابق رکھے گا باقی حاجت مندوں کی ضرورت کے لئے دے دے گا۔

(۶) تمام زمین اور وسائل (کارخانے) اسلامی معاشرے کی تحویل میں رہیں گے تاکہ وہ افراد کی پرورش کے کام آسکیں۔

(۷) ہر معاملے کا فیصلہ اللہ کے احکام (قرآن) کے مطابق ہو گا۔ اس معاشرے میں مذہبی فرقوں اور سیاسی پارٹیوں کا وجود نہیں ہوگا۔ نوع انسان کا آئین قرآن کریم ہے۔

یہ سب کچھ اس لئے ممکن ہوگا کہ ہر شخص اللہ کے احکام کی پابندی کرے گا اور مکافاتِ عمل کے برحق ہونے پر یقین رکھے گا۔ یہ نظام قائم ہی ان بنیادوں پر ہوگا اس میں قرآن کریم کی مستقل اقدار عملاً نافذ ہوں گی۔ اسلامی حکومت کے لئے امیر امت کے مشورے سے چنا جائے گا جو صرف قرآن کریم کے احکام پرعمل کرانے کا ذمہ دار ہوگا۔

ان هذا القران يهدى للتى هى اقوم

(بنی اسرائیل ۹)

بے شک قرآن انسانیت کے سفرِ زندگی میں اس راہ کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ جو سب سے زیادہ توازن بدوش اور سیدھی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن نے کیا کہا؟

آج کیفیت یہ ہو چکی ہے کہ جہاں کہیں دو مسلمان آپس میں ملیں وہ اپنی حالت کا رونا' رونا شروع کر دیتے ہیں۔ ہمارے معاشرہ میں یہ خرابیاں ہیں۔ مسلمانوں میں یہ کمزوریاں ہیں۔ نظم ونسق میں یہ نقائص ہیں۔ مملکت میں کوئی چیز اپنی جگہ پر قائم نہیں۔ کوئی کام صحیح انداز سے نہیں ہو رہا۔ ہر طرف تباہیاں اور بربادیاں ہیں' ہر سمت خرابیاں ہی خرابیاں ہیں۔ عوام لیڈروں کو کوستے ہیں کہ یہ سب نااہل ہیں۔ ان میں نہ قابلیت ہے نہ کیریکٹر۔ نہ دیانت ہے نہ امانت۔ ان سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ سب نالائق ہیں۔ دوسری طرف لیڈر' قوم میں کیڑے ڈالتے رہتے ہیں کہ ان میں نہ ڈسپلن ہے نہ تعاون کا جذبہ۔ نہ ایثار ہے نہ احساس فرض۔

قوم اور لیڈروں کے یہ عیوب ونقائص تو سب کو نظر آتے ہیں لیکن کسی کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ ان حالات میں کیا کیا جائے؟ چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اب ہر طرف مایوسی ہی مایوسی پھیل رہی ہے۔ لوگ اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ حالات اس درجہ خراب ہو چکے ہیں کہ اب ان کے سدھرنے کی کوئی شکل نہیں۔ چنانچہ ارباب بست وکشاد اور عوام میں جو بُعد پہلے ایک لکیر کی سی حیثیت رکھتا تھا اب گہری خلیج بن چکا ہے اور کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس خلیج کو کس طرح پاٹا جائے۔

قرآن ان حالات کا حل بتاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سب سے پہلے یہ اصول یاد رکھو کہ لا تستوی الحسنۃ ولا السئۃ۔ تعمیری کام اور تخریبی کام دونوں کبھی یکساں نہیں ہو سکتے۔ اب سوال یہ ہے کہ جب تخریبی عناصر عام ہو جائیں تو ان کا علاج کیا کیا جائے۔ وہ کہتا ہے کہ ادفع بالتی ھی احسن۔ تخریبی کوششوں کی مدافعت کا طریقہ یہ ہے کہ تم زیادہ سے زیادہ تعمیری کام کرنے شروع کر دو۔ جب یہ کرو گے تو تم دیکھو گے کہ فاذ الذی بینک وبینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم (۱۱/۳۴) وہ لوگ جن میں اور تم میں اس قدر بُعد پیدا ہو چکا ہے کس طرح تمہارے گرم جوش رفیقِ کار بن جاتے ہیں۔ یعنی محض تنقید اور عیب جوئی سے حالات نہیں سدھر سکتے۔ حالات سدھارنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ تم زیادہ سے زیادہ تعمیری کام کرتے جاؤ۔

لیکن اس کے لئے بڑی پختگی سیرت اور استقامتِ عمل کی ضرورت ہے۔ وما یلقھا الا الذین صبروا۔ یہ چیز صرف ان لوگوں کو مل سکتی ہے جو بڑے صاحبِ ہمت واستقامت ہوں۔ وما یلقھا الا ذو حظ عظیم (۴۱/۳۵)۔ یہ توفیق انہی کو ارزاں ہوسکتی ہے جنہیں زندگی کے بنیادی جوہروں سے حصہ وافر ملا ہو۔

یاد رکھو! کسی کے بڑے ہونے کی پہچان یہ ہے کہ وہ کس قدر تعمیری کام کرتا ہے اور اس کی وجہ سے معاشرہ کے حسن میں کس قدر اضافہ ہوتا ہے! جس میں یہ خوبیاں نہیں ہیں وہ بڑا بننے کا مستحق نہیں ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عہدِ حاضر میں سنتِ رسول ﷺ کی اہمیت

مولانا تقی امینی کے ایک مقالہ سے جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی تھیالوجیکل سوسائٹی کی طرف سے یونین ہال میں پڑھا گیا تھا۔ ماہنامہ فکر ونظر' نے کچھ اقتباسات شائع کئے تھے' ان میں سے چند ایک یہاں پیش کئے جاتے ہیں' آپ فرماتے ہیں:۔

''ہدایت الٰہی کسی معاشرے کو وجود میں نہیں لاتی ہے بلکہ انسان کے ہاتھوں معاشرہ وجود میں آتا ہے' جس میں خیر وشر دونوں کی نمود اور خوبیوں کے ساتھ خامیوں کا ظہور ہوتا ہے!''۔۔ پھر فرمایا کہ۔۔

''ہدایت الٰہی اپنے نزول کے زمانے میں اس وقت کے معاشرے کو محض خیر وشر کی نسبت سے بطور نمونہ پیش کرتی ہے' اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسان اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں سے دستبردار ہو کر زندگی کی گاڑی کو اسی معاشرے پر چلاتا رہے اور ترقی یافتہ عمارت کے مقابلے میں ہمیشہ اسی عمارت کی طرف دعوت دیتا رہے۔ مقصود عمارت نہیں ہوتی بلکہ خیر وشر کی وہ نسبت اور عدل واعتدال کی وہ قوت ہوتی ہے جو ہدایت الٰہی کے ذریعہ پیدا ہوتی ہے اور بطور نمونہ اسی کو پیش کرتی ہے!''

پھر فرمایا کہ۔۔ ''معاشرہ فطری افتاد کے مطابق ترقی کرتا اور بدلتا رہے گا۔ اس کو نہ کسی کا جمود روک سکتا ہی اور نہ کسی قوم کا زوال بریک لگا سکتا ہے۔ اب اگر کسی کو جمود توڑنا اور زوال کو ختم کرتا ہے تو ذہنی اور فکری تبدیلی کے ساتھ اس کے اپنے زمانہ کی تنظیمی' ترقیاتی چیزوں کو قبول کرنا ناگزیر ہے!''۔۔!!

پھر فرمایا کہ۔۔ ''جدید معاشرہ کی راہنمائی کے لئے بنیادی نقطۂ نگاہ یہ بنانا پڑے گا کہ اگر اس وقت ہدایت کے نزول کا زمانہ ہوتا اور محسنؐ کائنات خود بنفس نفیس تشریف فرما ہوتے تو آپؐ جلب منفعت اور دفع مضرت کا کس قدر لحاظ فرماتے اور معاشرتی فلاح و بہبود کی چیزوں میں کس جذبہ کو ملحوظ رکھتے۔ اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ نے اپنے زمانے کے معاشرے کو ''ہدایت'' کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے 'ازالہ' (Replacement) کی بجائے 'امالہ' (Addition) کی جو روش اختیار فرمائی ہے اور ترمیم وتنسیخ نیز تدریج وتخفیف کے جن اصول وضوابط سے کام لیا ہے وہ سب جدید معاشرہ کی راہنمائی کے لئے دلیل راہ کی حیثیت رکھتے ہیں!''

مولانا موصوف نے اپنی ایک اہم تصنیف: ''احکام شرعیہ میں زمانہ اور حالات کی رعایت!''۔۔ میں تفصیل کے ساتھ اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب سے چند اہم باتیں پیش کی جاتی ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ۔۔

''مسلم قوم کے زوال نے ایک نئے دور کو جنم دیا ہے۔ اس نئے دور کے نظریات نے ایمان واعتقاد کی بنیادیں ہلا دی ہیں اور معاشرہ کی تشکیل نے مذہب وزندگی کے ہر شعبہ میں بے شمار نئے مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ پہلے تجدید دین کی بات ایک معاشرہ تک محدود تھی۔ اب اس کا تعلق ایک 'دور' سے مل گیا ہے!''۔۔

پھر فرماتے ہیں:

''پچھلا دور اپنی سابقہ شکل میں پھر واپس نہیں آتا ہے۔ قانون فطرت کے مطابق کوئی دور اس طرح ختم نہیں ہوتا کہ وہ دوبارہ اپنی شکل میں واپس آئے اور کوئی دنیا اس لئے نہیں لٹتی ہے کہ وہ اپنی سابقہ حالت پر پھر آباد کی جائے...... اس بناء پر یہ توقع فضول ہے کہ سابق دور واپس آئے گا اور اسکے معاشرہ میں ملکی ومعاشرتی قانون علیٰ حالہٖ نافذ ہوں گے۔ اب نئی دنیا کو قبول کئے بغیر چارہ نہیں ہے!''

پھر فرمایا کہ۔۔

''مذہب کی نمائندگی جس انداز سے ہو رہی ہے اس میں بڑی حد تک فکر وعمل کی وہی خصوصیتیں موجود ہیں جو دور زوال کی یادگار ہیں اور جن کو زمانی تبدیلیوں نے پائمال بنا دیا ہے۔ چنانچہ اس امر پر سب کو اتفاق ہے کہ اسلام زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ لیکن ان شعبوں کی تفسیر وتعبیر میں اب تک جاگیردارانہ ذہنیت کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔۔!''

پھر فرمایا کہ۔۔

''یہ کام جرأت وہمت اور کھلے دماغ کے ساتھ براہ راست غور وفکر کے بغیر سرانجام نہیں پا سکتا۔ لیکن مذہب کے نام پر مختلف برادریاں اور گروہی تعلقات کی جکڑ بندیاں کچھ اس طرح گرفت میں لئے ہوئے ہیں کہ ان سے صرف نظر کر کے جرأت وہمت کے مظاہرے کی توقع بے سود ہے اور ان کو ساتھ لے کر کھلے دماغ کے ساتھ کسی فیصلے کی امید بے کار ہے!''

پھر فرمایا کہ۔۔۔

اندازِ فکر بدلنے کی ضرورت ہے۔ مذہب اب تک قدیم تنظیم کو سمجھا جا رہا ہے۔ چونکہ اس کا دور ختم ہو چکا ہے۔ اس بناء پر مذہب کے نام پر چند مراسم عبادت سے زیادہ کی گنجائش نہیں ہے۔ خواہ اس کا نام حفاظت دین رکھا جائے یا طبیعت خوش کرنے کے لئے اقامت دین کا نام دے دیا جائے' نتیجہ ایک ہے' نہ قرونِ وسطیٰ کا دور واپس آئے گا اور نہ زمانہ ہماری خاطر رجعتِ قہقہری اختیار کرے گا۔''

مزید فرمایا کہ۔۔۔

''دنیا اپنی تنظیمات میں رجعتِ قہقہری نہ اختیار کرے گی اور زمانہ ہماری خاطر قدیم شکلوں کو قبول نہ کرے گا۔ اگر زندہ رہنا ہے تو لامحالہ احکام کے موقع و محل کی تعیین کر کے اسلام کی روح اور تعلیمات کو جدید تعلیمات میں بھرنا ہوگا''۔۔!!

پھر فرمایا کہ۔۔۔

''موجودہ دور میں مسلم ممالک طبقاتی کشمکش کی جس منزل پر پہنچے ہوئے ہیں۔ اگر مذہبی پلیٹ فارم سے انفرادی ملکیت کی آڑ میں سرمایہ داری و جاگیرداری نظام کی تبلیغ و تائید کی جاتی رہی تو لازمی طور پر وہ اشتراکیت کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور ہوں گے''!

اس عالی پایہ کتاب سے آخری اقتباس دے کر بحث کو ختم کرتا ہوں۔ آپ فرماتے ہیں کہ۔۔۔

''مسلم معاشرہ ایک مرحلہ سے گذر کر دوسرے مرحلہ میں قدم رکھ چکا ہے اور آشیانہ بنانے کے لئے تنکوں کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ یہ سرگردانی اس لئے کہ دوسری دنیا کے آشیانے اس طائر لاہوتی کے جسم و روح پر فٹ نہیں آ رہے ہیں اور اس کا اپنا آشیانہ جس دور میں تھا وہ دور ختم ہو چکا ہے۔ اس میں جس دنیا کے تنکے تھے وہ دنیا لٹ چکی ہے۔ قانون فطرت کے مطابق کوئی دور اس طرح ختم نہیں ہوتا کہ وہ دوبارہ اپنی شکل میں واپس آئے اور کوئی دنیا اس طرح نہیں لٹتی کہ وہ اپنی سابقہ حالت پر پھر آباد کی جائے۔ یہ عالم کون و فساد ہے۔ یہاں بگاڑ کے ساتھ بناؤ' اور تخریب کے ساتھ تعمیر ہے۔ خود فطرت ہر گوشہ میں کانٹ چھانٹ کرتی اور خوب سے خوب تر شے کو فٹ کرتی ہے۔ جب کوئی شے ایک جگہ فٹ ہو جاتی ہے تو کمتر شے کے لئے وہ جگہ نہ چھوڑے گی بلکہ قبضہ کے لئے اس سے بلند تر اور برتر شے کا ہونا ضروری ہے!''

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ دلنواز

تحریکِ طلوعِ اسلام، ملک کی وہ واحد شمعِ فروزاں ہے جو مفکرِ قرآن علامہ غلام احمد پرویزؒ کے ہاتھوں روشن ہوئی اور جس نے اکنافِ عالم میں نورِ قرآنی کی ضیاء پاشیوں کو عام کرنے کا ذمہ اٹھا رکھا ہے۔

مفکرِ قرآن علیہ الرحمتہ کی وفات کے بعد، اس شمعِ قرآنی کے علمبرداروں نے جس خلوص، لگن، جانفشانی اور ان تھک محنت سے اس تحریک کو مزید وسعتوں سے ہمکنار کیا، اس کے اثرات نے جہاں وابستگانِ دامنِ قرآنی کے لئے ہزار مسرتوں اور شادمانیوں کے سامان فراہم کئے، وہیں کچھ عناصر ان سے یوں آتش زیرپا ہوئے کہ انہوں نے اس تحریک اور اس کے منتظمین کے بارے میں کئی قسم کی بدگمانیوں کی وسیع پیمانے پر تشہیر شروع کر دی۔

ہمیں یقین ہے کہ وابستگانِ تحریک، قرآن کریم کی اُس تعلیم کے صدقے جسے مفکرِ قرآن زندگی بھر عام کرتے رہے، اتنی سمجھ بوجھ رکھتے ہیں کہ ان حاسدینِ تحریک کے دام ہائے ہمرنگِ زمین کے فریب میں نہیں آئیں گے کیونکہ یہ سب، تمام تر مخالفانہ پراپیگنڈہ کے علی الرغم، تحریک کے فروغ اور تقدم کا مشاہدہ اپنی چشمِ بینا سے بذاتِ خود کر سکتے ہیں۔

کچھ ایسے ہی حالات، مفکرِ قرآن کی اپنی زندگی میں بھی (۱۹۶۴ء میں) ان کے لئے وجۂ پریشانیٔ خاطر ہوئے تھے جن کی بنا پر انہوں نے مندوبینِ طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۶۴ء کو اپنی منفرد قرآنی بصیرت کی روشنی میں ''حرفِ دلنواز'' کے عنوان سے خطاب فرماتے ہوئے وابستگانِ تحریک کو ایسے عناصر کی ریشہ دوانیوں سے خبردار کیا اور ان سے مجتنب رہتے ہوئے اپنے مشن کے مقاصد کے حصول کے لئے اپنی مساعی کو تیز تر کرنے کی تلقین کی تاکہ نوعِ انسانی کو بتایا جائے کہ اس کی مشکلات کا حل قرآن کی بارگاہ کے سوا کہیں اور سے نہیں مل سکتا۔

ادارہ اُن کے اس خطاب کو، بلا کم و کاست، بارِ دگر پیش کرتے ہوئے احباب سے اسی احتیاط اور توجہ کی توقع رکھتا ہے۔ جس سے انہوں نے مفکرِ قرآن کی ندائے دردمند پر لبیک کہا تھا۔

نُورِ خدا ہے کُفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

واللہ المستعان

(بحوالہ طلوعِ اسلام، اکتوبر ۱۹۸۹ء)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

زمیلانِ قافلہ قرآنی!

آپ پر ہزار ہزار سلام و رحمت ہو۔

میرا سرِ نیاز، بارگاہِ ایزدی میں سجدہ ریز ہے کہ اس نے

ایک بار پھر موقعہ بہم پہنچایا کہ خمخانۂ قرآنی کے بادہ نوش، اپنے سروں میں کیفِ صہبائے حجازی کی خرد فروزیاں، اور اپنے دلوں میں، فطرتِ روح الامینی کی سکون آمیزیاں لئے، وجۂ شادابیٔ محفل ہوئے ہیں۔ اس دَور میں، جبکہ کشاکشِ حیات ایسی شدید، اور غمِ دوراں اس قدر گراں نشیں ہو رہا ہے، اس قسم کے فرصت کے چند لمحات کا میسر آ جانا، جن میں کسی کی نشیدِ جانفزا پکار پکار کر کہہ رہی ہو کہ۔

اس کی محفل میں بیٹھ کر دیکھو
زندگی کتنی خوبصورت ہے

ازبس مغتنمات میں سے ہے۔ آیئے ہم، ان چند لالہ رنگ و نشاط آہنگ ساعتوں میں، جنہیں ہم نے سورج کی کرنوں سے نچوڑ کر اپنی مٹھی میں دبا رکھا ہے، خدائے عظیم کی اُس کتاب جلیل کا تذکرۂ حسین و جمیل کریں جس کے متعلق صبحِ بہارِ کائنات کی ہر رنگینی کا تبسمِ پنہاں، اس رازِ فطرت کی غمازی کر رہا ہے کہ

یہ غنچوں کی رنگت، یہ پھولوں کی نکہت
اسی کا تبسم، اسی کے اشارے

اور قدح برداران ساقیٔ کوثر و تسنیم، انتہائی جذب و کیف کے عالم میں، ایک دوسرے سے کہہ رہے ہیں کہ

دوستو! اُس چشم و لب کی کچھ کہو جس کے بغیر
گلستاں کی بات رنگیں ہے، نہ میخانے کا نام

ایک خطرناک گروہ

میرے عزیز رفیقو! ہم آج قریب ڈیڑھ سال کی طویل مدت کے بعد، مل رہے ہیں۔ اس دوران میں کچھ میری مسلسل علالت، اور کچھ دیگر نامساعد حالات کی وجہ سے، جن کے تذکرۂ جگر سوز سے میں آپ کی اس محفلِ کیف و نشاط کو افسردہ و پژمردہ نہیں کرنا چاہتا، ہماری تحریک قدرے نرم رو ہو گئی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہم اب اس وادیٔ پُر خار سے آگے نکل آئے ہیں، اس لئے اب ہم اپنے نئے عزائم اور تازہ ولولوں سے، بتوفیقِ ایزدی، اس کمی کو جلد پورا کر لیں گے۔ لیکن، برادرانِ گرامی قدر! قبل اس کے کہ ہم اپنا سامانِ سفر تازہ کر کے پھر جادہ پیمائے منزل ہوں، ضروری ہے کہ ہم قرآن کی شمع نورانی کی روشنی میں اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیں اور دوسری طرف خود اپنا احتساب کریں۔۔۔ اس لئے کہ جو راہ روِ سفرِ زندگی میں احتسابِ خویش نہیں کرتے اور گرد و پیش پر نگاہ نہیں رکھتے، وہ اپنے آپ کو رہزنوں کی تاراج سے محفوظ اور کیسہ تراشوں کی چابکدستیوں سے مامون تصور نہیں کر سکتے۔ رہروانِ سفرِ حیات کی نگاہیں بالعموم ان مخالفین کی طرف اٹھتی ہیں جو للکار کر سامنے آتے اور پکار کر حملہ کرتے ہیں لیکن قرآن کریم ان کھلے دشمنوں سے کہیں زیادہ نقصان رساں اور تباہ کن ان فتنہ پرور عناصر کو قرار دیتا ہے جو رفاقت کے نقاب میں اس قافلہ میں شامل ہوں۔ خدمت و ایثار کے بہروپ میں اپنے ساتھیوں کا اعتماد حاصل کریں اور انتہائی نازک مرحلہ پر ان کی متاعِ حیات پر شبخون ماریں۔ آپ دنیا کی تاریخ۔۔۔ اور انتہائی ندامت سے سر جھکا کر کہنا پڑتا ہے کہ خود مسلمانوں کی تاریخ۔۔۔ پر نگاہ ڈالیں۔ آپ دیکھیں گے کہ کسی تحریک کو غیروں کے ہاتھوں اس قدر نقصان نہیں اٹھانا پڑا جس قدر تباہی کا موجب خود ''اپنوں'' کی فتنہ سامانیاں بنی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم، اپنے اولیں اوراق میں، ان دو جماعتوں کے اجمالی تذکرہ کے بعد، جو کھلے

بندوں اس کی دعوت پر ایمان لاتیں یا دھڑلے سے اس کی مخالفت کرتی ہیں، اس گروہ کا ذکر تفصیل سے کرتا ہے جن کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

من یقول امنا باللہ و بالیوم الاٰخر و ما هم بمومنین (۲/۸)

وہ دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ وہ مومن ہیں لیکن درحقیت وہ مومن ہوتے نہیں یہ ان کا صرف زبانی دعویٰ ہوتا ہے۔ ان میں سے کچھ تو وہ ہوتے ہیں جو اس جماعت کے اندر داخل ہوتے ہی تخریب کے لئے ہیں، اور کچھ ایسے جو اپنے خاص مقاصد لے کر ان کے ساتھ شامل ہوتے ہیں۔ ان کے متعلق کہا ہے کہ یہ اپنی دانست میں ”خدا اور جماعتِ مومنین کو دھوکا دیتے ہیں“ لیکن درحقیقت۔ وما یخدعون الا انفسھم وما یشعرون (۲/۹)۔ وہ خود اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں۔ لیکن اس حقیقت کو سمجھتے نہیں۔ اس لئے کہ وہ جذبات کی رو میں بہے چلے جاتے ہیں اور جب انسان پر جذبات غالب آ جائیں تو اس کی عقل وفکر ماؤف ہو جاتی ہے۔

نفسیاتی مرض

قرآن کہتا ہے کہ فی قلوبھم مرض۔ ان کے دلوں میں روگ ہوتا ہے۔ یہ نفسیاتی مریض ہوتے ہیں۔ نفاق درحقیقت نفسیاتی مرض ہے جس سے انسان اپنے آپ کو دھوکے میں رکھتا ہے اور بظاہر سمجھتا یہ ہے کہ وہ بالکل صحیح راستے پر چل رہا ہے۔ (اس مرض کی تفصیل ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی)۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ لا تفسدوا فی الارض تم تخریبی کاروائیاں مت کرو۔ خواہ مخواہ فساد پیدا نہ کرو۔ تو یہ جواب میں کہتے ہیں کہ انما نحن مصلحون۔ یہ کیا کہا آپ نے! ہم فساد پیدا کرتے ہیں؟ ہمارے جیسا اصلاح کرنے والا اور کون ہے۔ ہماری ہر تدبیر معاملات کو سنوارنے اور اس تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے ہے۔ فساد تو وہ پیدا کر رہے ہیں جو ہماری مخالفت کرتے ہیں۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ امنو کما امن الناس۔ اگر تم اصلاح کرنے کا ارادہ رکھتے ہو تو پھر ان لوگوں جیسی روش اختیار کرو جو اس تحریک کے ساتھ ہیں۔ تو ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ یہ تو شخصیت پرستوں کا گروہ ہے جو اندھی عقیدت میں بہے چلے جا رہے ہیں، ہم ان جیسے احمق تھوڑے ہیں۔ اور قرآن کا جواب یہ ہوتا ہے کہ الا انھم ھم السفھاء و لکن لا یعلمون (۲/۱۳) یاد رکھو! سب سے بڑے احمق یہ خود ہیں۔ لیکن اس بات کو سمجھتے نہیں، اس لئے کہ یہ جذبات سے کام لیتے ہیں۔ علم وعقل سے نہیں لیتے۔

کاروباری ذہنیت

سوال یہ ہے کہ یہ لوگ کون ہیں اور کیوں ایسا کرتے ہیں، قرآن نے دو آیتیں آگے جا کر اس سوال کا نہایت واضح جواب دیا ہے۔ اور وہ یہ کہ فما ربحت تجارتھم۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس تحریک میں کاروباری ذہنیت لے کر داخل ہوئے تھے۔ بس اس ایک نقطہ میں ساری تفصیل سمٹ کر آ جاتی ہے۔

قرآنی تحریک کی پوری عمارت للّٰہیت کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ للّٰہیت کے معنی یہ ہیں کہ اس میں داخل ہونے والے کے سامنے صرف ایک مقصد ہو۔ یعنی اس دعوت اور تحریک

کا فروغ اور کامیابی‘ اور اس کے ذریعے سے اپنی اصلاحِ نفس۔ اس میں شامل ہونے والے کی ذہنیت یہ ہونی چاہئے کہ ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العٰلمین لا شریک لہ (۶/۱۶۳)۔ میرے فرائض منصبی اور ان کی‘ بایں حسن وخوبی ادائیگی‘ یہ میرا تمام کاروبارِ حیات۔ میری زندگی اور میری موت۔ سب اس پروگرام کی تکمیل کے لئے ہے جو اس دعوت الی الحق کے سلسلہ میں مرتب کیا گیا ہے اس کے علاوہ کوئی اور مقصد میرے پیش نظر نہیں۔ اگر اس مقصد کے علاوہ کوئی اور جذبہ دل میں بیدار ہو گیا تو وہ للّٰہیت نہ رہی۔ سودا بازی ہو گئی۔ یہی وہ سودا بازی ہے جس کے لئے مفاد پرست لوگ قرآنی تحریک میں شامل ہوتے ہیں۔ جب تک وہ دیکھتے ہیں کہ اس کے ساتھ رہنے میں ان کا فائدہ ہے‘ وہ اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ جب اس فائدے پر زد پڑتی ہے تو اس سے علیحدہ ہو جاتے ہیں اور اس علیحدگی کے وقت ان کے دل کا روگ ابھر کر سامنے آ جاتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں یہ لوگ اس تحریک کے لئے مہیب خطرہ اور تخریب کا موجب بن جاتے ہیں۔ علیحدگی کے وقت وہ اس کا اعتراف تو کسی حالت میں نہیں کرتے کہ ہم ہی میں کچھ نقائص اور کمزوریاں تھیں جن کی وجہ سے ہم اس تحریک کے ساتھ نہیں چل سکے۔۔ اس قسمکے اعتراف کے لئے بڑی جرأت کی ضرورت ہوتی ہے۔ (اگر ان میں جرأت ہوتی تو یہ منافق ہوتے ہی کیوں‘ یہ یا کھلے بندوں مومن ہوتے یا نکھرے ہوئے کافر۔ بین بین کی راہ تو اختیار ہی وہ کرتا ہے جو جرأت و بسالت سے عاری ہو۔ یاد رکھئے۔ کاروباری ذہنیت اور جرأت دو متضاد عناصر ہیں جو ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے)۔ یہ لوگ اپنی کسی کمزوری کا اعتراف نہیں کرتے۔ اب دوسری صورت یہی باقی رہ جاتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کریں۔ وہ ایسا اسی شکل میں کر سکتے ہیں کہ وہ اس تحریک میں کیڑے ڈالیں۔ اس کے ساتھ وابستہ رہنے والوں کو بدنام کریں۔ اس کے داعیان کے خلاف الزام تراشی کی مہم شروع کر دیں۔ ان پر ذاتی حملے کریں۔ دنیا میں کہتے پھریں کہ ہم تو نہایت نیک نیتی سے اس تحریک میں شامل ہوئے تھے لیکن اندر جا کر معلوم ہوا کہ یہ سب دھوکا اور فریب ہے۔ اب جب ہم پر حقیقت حال منکشف ہو گئی ہے تو دیانتداری کا تقاضا ہے کہ ہم ان کا ساتھ چھوڑ دیں اور صحیح واقعات کی تشہیر کریں تا کہ دوسرے لوگ ان کے فریب میں نہ آ سکیں۔ وہ یہ مہم شروع کر دیتے ہیں اور چونکہ سننے والے اتنی تکلیف گوارا نہیں کرتے کہ جو کچھ سنا ہے اس کی تصدیق تو کرا لی جائے‘ ان کا پروپیگنڈا کامیاب ہو جاتا ہے۔

اس کا مفاد کیا ہوتا ہے

اس مقام پر ایک نہایت اہم اور نازک سوال سامنے آتا ہے اور جب تک اسے سمجھ نہ لیا جائے‘ کاروباری ذہنیت کا صحیح اندازہ لگایا نہیں جا سکتا۔ ایک شخص قرآنی تحریک میں شامل ہوتا ہے۔ اپنی گرہ سے روپیہ خرچ کرتا ہے۔ دن رات اس کے کاموں میں لگا رہتا ہے۔ وقت اور توانائی صرف کرتا ہے۔ اغیار کے طعنے بھی سنتا ہے۔ اور اس کے معاوضے میں اسے کچھ نہیں ملتا۔ نہ ہی کچھ ملنے کی توقع ہوتی ہے۔ جب وہ تحریک سے الگ ہوتا ہے تو اس چیز کو اپنی وفا شعاری اور خلوص وصداقت کے لئے بطور ثبوت پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بتایئے کہ اگر مجھ میں خلوص نہیں تھا تو

میں نے اتنا عرصہ اس قدر کام اور ایثار کیوں کیا؟ یہ بات بظاہر اس قدر وزنی نظر آتی ہے کہ لوگ اس کے قائل ہو جاتے ہیں اور وہ یوں اپنے تخریبی مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ لیکن قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ للّٰہیت کے مقابلہ میں انسان کے پیشِ نظر مالی مفاد ہی نہیں ہوتے۔ اکثر و بیشتر ایک ایسا مقصد ہوتا ہے جس کے سامنے مال و دولت اور جاہ و منصب سب ہیچ ہوتے ہیں۔ لیکن وہ مقصد کسی کو نظر نہیں آتا۔

ایغو کی تسکین

اسی کو وہ دل کا روگ یہ نفسیاتی مرض قرار دیتا ہے۔ اسے وہ ”عزت الاثم“ سے تعبیر کرتا ہے۔ دورِ حاضر کے علم النفس (سائیکلوجی) کی اصطلاح میں اسے (Egoism) کہا جاتا ہے۔ جو حضرات انسانی نفسیات سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ بیماری کس قدر شدید، گہری اور خوفناک ہوتی ہے، اور اس کے نتائج کس قدر تباہ کن۔ ایغو، انسان کے پندارِ نفس کو کہتے ہیں۔ یعنی بڑا بننے کی ہوس۔ ایک شخص کو آپ دیکھیں گے کہ وہ جیب سے روپیہ بھی صرف کرتا ہے اور پھر اجتماعات میں بیٹھا کبھی جھوٹے برتن صاف کر رہا ہے۔ کبھی جھاڑو دے رہا ہے۔ دریاں بچھا رہا ہے۔ کرسیاں اٹھا رہا ہے۔ لیکن مقصد اس سے صرف یہ ہوتا ہے کہ لوگ اس کی تعریف کریں اور اس طرح وہ ان کی نگاہوں میں بڑا بن جائے۔ اس سے اس کا نفس موٹا ہوتا ہے۔ اس کے پندار کی تسکین ہوتی ہے۔ جب تک ایسا ہوتا رہے وہ اپنے آپ کو اس تحریک کا فدائی اور ادنیٰ درجہ کا خادم کہہ کر پکارتا ہے۔ لیکن جہاں ایسا ہوا کہ اس کے پندار کو ٹھیس لگی، اس کا ایغو انتقام پر اتر آیا اور چونکہ اس سے عزت کا مقام چھن گیا ہوتا ہے اسے انتقام کی لذت اسی صورت میں ملتی ہے کہ وہ دوسروں کو ذلیل کرے۔ اس کے لئے وہ ہر حربہ استعمال کرتا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس سے اس کے دل کی آگ بجھتی نہیں اور بھڑکتی ہے۔ فی قلوبهم مرض فزادهم الله مرضا۔ و لهم عذاب الیهم بما کانوا یکذبون (۲/۱۰)۔ وہ اپنے مرض کا علاج یہ سوچتے ہیں کہ دوسروں کو جھٹلایا جائے۔ لیکن اس سے اس مرض کو آفاقہ ہونے کے بجائے وہ اور بڑھتا ہے۔ اس کا صحیح علاج کیا ہے، اس کا ذکر آگے چل کر آتا ہے۔

مدینہ کے منافقین

آپ ان احوال و کوائف پر نگاہ ڈالئے جو منافقین کے بارے میں قرآن میں مذکور ہیں تصریحاتِ بالا کی قدم قدم پر شہادت ملے گی۔ حضورؐ کی مکی زندگی میں منافقین کا ذکر نہیں ملتا۔ وہ لوگ بالعموم کمینہ فطرت نہیں تھے۔ اس لئے جس کا ساتھ دیتے تھے تو وہ بھی دل کی پوری کشادہ سے اور جس کی مخالفت کرتے تھے تو وہ بھی کھلم کھلا۔ لیکن مدنی زندگی میں ایسا نظر آتا ہے جیسے یہ لوگ گروہ در گروہ جماعت مومنین میں شامل ہو گئے۔ یاد رکھئے۔ یہ کوئی الگ گروہ نہیں تھا۔ یہ مسلمانوں کی جماعت میں شامل تھے۔ خدا اور رسولؐ پر ایمان لانے کے مدعی تھے انہی کے معاشرے کے افراد شمار کئے جاتے تھے۔ ان کے اجتماعات میں شریک ہوئے تھے۔ ان کے تمام مشوروں میں ان کے ہمراز بنتے تھے۔ غرضیکہ ایک مخلص مسلمان اور منافق میں (دل کی حالت کے سوا) کوئی اور تمیز نہ تھی۔ قرآن اس پر شاہد ہے۔ چنانچہ جب ان کی منافقت کا

پردہ چاک ہوا تو قرآن نے اسے ''کفر بعد از اسلام'' (۷/۷۴)۔ یا ایمان کے بعد کفر (۶۳/۳) سے تعبیر کیا۔ انہوں نے جماعت میں اس قدر اعتماد پیدا کر لیا تھا کہ نبی اکرمؐ انہیں میدان جنگ تک میں ساتھ لے جاتے تھے' حالانکہ ظاہر ہے کہ میدان جنگ بڑا ہی نازک مقام ہوتا ہے۔ اس میں منافقین کی شرکت' جماعت کا تختہ الٹ کر رکھ دیتی ہے۔ جنگ بدر میں تو ان کا ذکر نہیں کیونکہ وہ مشتمل تھی السابقون الاولون۔ اس کے بعد جنگ احد میں ان کا ذکر ہے۔ جنگ احزاب میں ان کی ریشہ دوانیوں کو طشت از بام کیا گیا ہے اور جنگ تبوک میں تو ان کی فتنہ سامانیاں انتہا تک پہنچ گئی تھیں۔ چنانچہ سورۂ توبہ بیشتر انہی کے واقعات پر مشتمل ہے۔

دو خیال کے مسلمان

ان کے اعتماد کا یہ عالم تھا کہ جب ان کی منافقت کا پردہ چاک ہوا اور ان کے خلاف کارروائی کرنے کی تجاویز سامنے آئیں' تو خود مسلمانوں میں دو پارٹیاں ہو گئیں۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ ان کے خلاف سخت اقدام کرنا چاہیئے۔ دوسروں کی رائے تھی کہ نہیں! اتنی بڑی جماعت کو اس طرح کاٹ کر پھینک دینا ٹھیک نہیں۔ ہمیں ان کی اصلاح کی کوشش کرنی چاہیئے۔ سورہ نساء میں انہی دو مختلف الخیال پارٹیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ۔۔ فما لکم فی المنٰفقین فئتین (۴/۸۸) تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم ان منافقین کے بارے میں دو پارٹیاں بن گئے ہو۔ جو لوگ انہیں ساتھ رکھنے کا مشورہ دیتے تھے ان سے کہا گیا کہ اتریدون ان تھدوا من اضل اللہ ۔ کیا تم ان لوگوں کو راہ راست پر لانے کے ارادے رکھتے ہو جو قوانین خداوندی کو چھوڑ کر غلط راستے پر چل نکلے ہیں؟ تم انہیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہو اور ودوا لو تکفرون کما کفروا فتکونون سواء اور ان کی انتہائی خواہش یہ ہے کہ جس طرح انہوں نے اس تحریک کا ساتھ چھوڑا ہے تم بھی اسی طرح اس کا ساتھ چھوڑ دو۔ تاکہ وہ اور تم برابر ہو جاؤ۔ (۴/۵۹)۔ ان کے علاوہ قرآن نے کچھ ایسے لوگوں کا بھی ذکر کیا ہے جو چاہتے تھے کہ ان یامنوکم و یامنوا قومھم (۴/۹۱) مسلمانوں کی طرف سے بھی امن میں رہیں اور اپنی پارٹی کی طرف سے بھی۔ یعنی۔۔ با ما نماز کر و و بہ زاہد شراب خورد۔ کی دوغلی پالیسی پر عمل کرنے والے۔

الزام تراشی

جب اس طرح ان لوگوں کی منافقت کا پردہ چاک ہوتا تو وہ الزام تراشیوں اور بہتان بافیون کے اوچھے اور کمینے ہتھیاروں پر اتر آتے۔ پہلے وہ ان لوگوں کے خلاف طعن و تشنیع شروع کر دیتے جو جماعت کا ساتھ نہ چھوڑتے۔ ان میں سے جو لوگ تحریک کے کاموں کے لئے کچھ صرف کرنے کے قابل ہوتے یہ ان کی نیتوں پر حملے کرتے۔۔ الذین یلمزون المطر عین من المومنین فی الصدقٰت ۔۔ اور جو غریب صرف محنت سے جماعت کے کاموں میں حصہ لیتے' یہ ان کا تمسخر اڑاتے۔ والذین لا یجدون الا جھدھم فیسخرون منھم (۹/۷۹) جو لوگ اس جماعت کی مالی امداد کرتے ان سے جا جا کر کہتے کہ ان کی امداد مت کرو۔ یہ سب

دھوکا باز اور فریب کار ہیں۔ هم الذین یقولون لا تنفقوا علی من عند رسول اللـه حتی ینفضوا (۷/۶۳) تم جب اس تحریک کی امداد نہ کرو گے تو یہ لوگ اس رسولؐ کا ساتھ چھوڑ کر خود بخود تتر بتر ہو جائیں گے۔

دوسری چالیں

ان کی اسکیم یہ بھی ہوتی کہ اپنے میں سے کچھ لوگوں کو تیار کرتے کہ وہ اس جماعت میں جا کر شامل ہو جائیں اور پھر ان میں بددلی پھیلا کر ان سے الگ ہو جائیں تاکہ اس طرح اس جماعت کے کچھ افراد بھی ان کی ساتھ نکل آئیں۔ یہ ان سے کہتے کہ امنوا وجه النهار و کفروا آخره۔ لعلهم یرجعون (۳/۷۱) ”تم صبح کے وقت ایمان کا نقاب اوڑھ کر ان کے ساتھ جا ملو اور شام کو ان سے الگ ہو جاؤ۔ اس طرح شاید ان میں سے کچھ لوگ تمہارے ساتھ واپس لوٹ آئیں۔“ پھر، ان کی چال یہ بھی ہوتی کہ اس جماعت کے افراد سے الگ الگ ملتے اور انہیں، جماعت سے بالا بالا انفرادی طور پر راضی کر لینے کی کوشش کرتے تاکہ اس طرح جماعت کمزور ہو جائے۔ یحلفون بالله لکم لیرضوکم۔ یہ تمہارے سامنے خدا کی قسمیں کھا کھا کر تمہارے ہمدرد اور بہی خواہ بنتے ہیں تاکہ تمہیں انفرادی طور پر اپنے ساتھ ملانے پر راضی کر لیں۔ ان سے کہا گیا کہ واللـه و رسولـه احق ان یرضوه ان کانوا مومنین (۹/۶۲) اگر تم مومن ہو تو تمہارا جواب یہ ہونا چاہئے کہ سوال ہماری انفرادی رضامندی کا نہیں۔ سوال اس نظام خداوندی کی رضامندی کا ہے۔ اگر وہ تمہیں معاف کر کے تم سے راضی ہو جائے تو ہم بھی تم سے راضی ہو جائیں گے۔ لیکن اگر تم اسے راضی نہ کرو اور کوشش کرو کہ ہم اُس سے بالا بالا تم سے راضی ہو جائیں تو یہ بات ایمان کے منافی ہے یہ جماعت سے غداری ہے، جس کی کم از کم ہم سے توقع نہ رکھو۔

حضورؐ پر ذاتی حملے

وہ اس سے بھی آگے بڑھتے اور خود اس تحریک کے داعی حضور رسالتمآبؐ پر ذاتی حملے شروع کر دیئے۔ کبھی کہتے کہ یہ تو ڈکٹیٹر ہے۔ اپنی سی چلائے جاتا ہے۔ ہماری مانتا ہی نہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ مسلمانوں کو شکست پر شکست ہوتی چلی جا رہی ہے یقولون هل لنا من الامر من شئ۔۔ کہتے ہیں کہ ان معاملات میں ہمارا بھی کچھ عمل دخل ہے یا یہ اپنی من مانی ہی کرتا جائے گا۔ یقولون فی انفسهم ما لا یبدون لک۔ یہ لوگ اس قسم کی باتیں کچھ اس انداز سے کرتے ہیں گویا ان کے دل میں تحریک کا بڑا درد ہے اور یہ اس سے مجبور ہو کر ایسے شکوے کرتے ہیں لیکن جو زہر ان کے دل میں بھرا ہے اسے ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ کہتے ہیں کہ لو کان لنا من الامر شی ما قتلنا هٰهنا (۳/۱۵۳)۔ اگر اس معاملہ میں یہ ہماری سنتا تو ہم اس طرح جنگ میں کبھی نہ مارے جاتے، لیکن واللـه علیم بذات الصدور (۳/۱۵۳) خدا خوب جانتا ہے کہ ایسا کہنے سے ان کا درحقیقت منشاء کیا ہے۔۔ کبھی کہتے کہ هو اذن (۹/۶۱)۔ یہ بڑا کانوں کا کچا ہے۔ اپنی کوئی رائے ہی نہیں رکھتا۔ جو کچھ کسی نے آ کر کہہ دیا اسے صحیح تسلیم کر لیا اور اس کے مطابق فیصلے دینے شروع کر دیئے۔ وہ یہاں تک بھی کہتے کہ اس

پر وحی وغیرہ کچھ نازل نہیں ہوتی۔ نہ ہی اس میں خود اتنی قابلیت ہے کہ اس قسم کی باتیں اپنے ذہن سے کر سکے۔ انما یعلمه بشر (۱۶/۱۰۳)۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ سب کسی اور شخص کے ذہن کی پیداوار ہے۔ وہی آ کر اسے سکھا جاتا ہے۔

انتہائی کمینگی

اس قسم کے کمینہ فطرت لوگوں کا آخری حربہ یہ ہوتا ہے کہ اس داعیٔ انقلاب کے خلاف پیسے کے معاملہ میں الزامات لگا دیئے جائیں۔ غور فرمایئے کہ وہ ذاتِ اقدس واعظمؐ جسے زمانہ قبل از نبوت میں لوگ امین کہہ کر پکارتے تھے۔ جس کے متعلق ہرقل کے دربار میں ابوسفیان جیسا سخت دشمن بھی اس کا اعتراف واعلان کرتا تھا کہ ہم نے اس میں جھوٹ اور بددیانتی کی کوئی بات نہیں دیکھی۔ اس ذاتِ گرامی کے متعلق یہ بدنہاد مشہور کرتے تھے کہ آپ (معاذ اللہ) پیسے کے معاملہ میں گڑبڑ کرتے ہیں۔ و منهم من یلمزك فی الصدقٰت (۹/۵۸)۔ ان میں وہ بھی ہیں جو بیت المال کے روپے کے معاملہ میں بھی تجھ پر الزام لگاتے اور طعنے دیتے ہیں۔ غور کیجئے کہ ان باتوں سے حضورؐ کا کلیجہ کس طرح چھلنی نہیں ہوتا ہوگا!

الزام تراشی کے نتائج

قرآن کریم نے الزام تراشی کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس لئے کیا ہے کہ کسی شخص کو اس کے مقام سے گرانے' اور اسے اذیت پہنچانے اور ذلیل کرنے کے لئے یہ سب سے زیادہ مؤثر حربہ ہوتا ہے۔ آپ اپنی روزمرہ کی زندگی پر غور کیجئے۔ آپ نہایت شرافت سے پر اطمینان زندگی بسر کر رہے ہیں کہ ایک فتنہ جو آپ کے خلاف ایک الزام لگا دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آپ ایک منٹ میں اپنے مقام سے گر کر اس کی سطح پر آ جاتے ہیں اور ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد آپ دنیا جہاں کے کام چھوڑ کر' اپنی مدافعت پیش کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ اس میں جج کون ہوتا ہے؟ ہر وہ ایرا غیرا جو آپ سے پوچھے کہ اس الزام کی حقیقت کیا ہے۔ اگر آپ اس کے سامنے اپنی صفائی پیش نہیں کرتے اور معذرت کر دیتے ہیں تو وہ باہر جا کر مشہور کر دیتا ہے کہ یہ جھوٹا ہے۔ اگر سچا ہوتا تو اپنی صفائی پیش نہ کرتا؟ جب آپ صفائی پیش کرتے ہیں تو اکثر و بیشتر نہایت معتبر بن کر کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے نزدیک کچھ قصور اس (الزام لگانے والے) کا ہے کچھ ان کا ہے۔ جو زیادہ تفصیل میں نہیں جاتے وہ اتنا کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ صاحب! کچھ تو بات ہوتی ہی ہے جس کی وجہ سے کسی پر الزام لگتا ہے۔ یوں کس کا سر پھرا ہے کہ دوسروں کو مفت میں بدنام کرے۔ لیکن ہمیں اس جھگڑے سے کیا؟ پھر بہی خواہوں اور ہمدردوں کا گروہ باہر نکلتا ہے کہ ان دونوں میں مصالحت کی کوشش کی جائے۔ مصالحت کی کوشش کی بنیاد اس مفروضہ پر ہوتی ہے کہ غلطی دونوں سے ہوتی ہے۔

---۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ ایسا سمجھنے اور کہنے کے لئے دلیل کیا ہوتی ہے؟ یہ محاورہ کو صاحب! تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ اس محاورے کو ایسے پیش کر دیا جاتا ہے گویا یہ قرآن کی آیت ہے اور کہنے والا اتنا بھی نہیں سوچتا کہ جس آواز کو اس نے تالی کی آواز سمجھا تھا وہ کہیں طمانچے کی آواز تو نہ تھی جو کسی دراز دست نے کسی بے گناہ کے منہ پر دے مارا تھا! بہرحال یہ

مصالحت کرانے والے بلاتحقیق کہہ دیتے ہیں کہ صاحب! غلطی دونوں سے ہوئی ہے۔

اب صلح جوئی اور امن پسندی کا تقاضا ہے کہ کچھ وہ ہٹے کچھ یہ بڑھیں۔ اور اگر یہ بڑھنے پر آمادہ نہیں ہوتے تو پھر ان کے اچھے اچھے بہی خواہ بھی ناراض ہو کر کوسنے لگ جاتے ہیں کہ بڑا ضدی واقع ہوا ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ الزام تراشی کس قدر مؤثر حربہ اور کیسا اذیت دِہ نشتر ہے۔ قرآن کریم نے ان لوگوں کے متعلق کہا ہی یہ ہے کہ و منهم الذين يؤذون النبى (۹/۶۱) ''ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو نبی کو اذیت پہنچانا چاہتے ہیں۔'' اذیت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ روپے کی تقسیم کے متعلق الزام کے سلسلہ میں حضورؐ کو اپنی مدافعت پیش کرنی پڑی۔۔۔ غور فرمایئے! دنیا کا عظیم ترین انسان (علیہ التحیۃ والسلام) جس کے متعلق خود خدا شہادت دیتا ہے کہ وہ اخلاق کی بلند تریں سطح پر ہے۔ وہ مجمع کے سامنے اپنی بریت پیش کر رہا ہے کہ میں نے بددیانتی اور بے انصافی سے کام نہیں لیا۔ پناہ بخدا! فتنہ پرور عناصر کی اذیت کوشیاں اس حد تک چلی جاتی ہیں!

☆☆☆☆☆☆☆

مسجد ضرار

پھر تماشا یہ کہ یہ لوگ یہ سب کچھ کرتے لیکن اس کے باوجود اپنے آپ کو اس تحریک کا مخلص حامی بھی ظاہر کرتے۔ چنانچہ جب انہوں نے جماعت میں تفرقہ پیدا کرنے کی آخری اسکیم سوچی ہے تو اسکے لئے کوئی مخالف تحریک نہیں شروع کی۔ انہوں نے ایک مسجد تعمیر کی۔۔ کوئی گرجہ یا بتکدہ نہیں بنایا۔ اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ مسلمان کسی دوسری تحریک کے ساتھ وابستہ ہو نہیں سکتے۔ یہی وہ مسجد تھی جس کے متعلق قرآن نے کہا کہ وہ مسجد نہیں بلکہ کفراً و تفریقاً بین المومنین و ارصاداً لمن حارب الله۔ و رسوله من قبل (۹/۱۰۸)۔ یہ مسجدِ ایمان کا نہیں کفر کا مرکز ہے۔ یہ مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے کے لئے کھڑی کی گئی ہے۔ یہ درحقیقت ایک کمین گاہ ہے ان لوگوں کے لئے جو اس سے پہلے اس تحریک سے الگ ہو کر مقابلہ کے لئے کھڑے ہوگئے تھے لیکن انہیں کوئی مرکز نہیں ملتا تھا۔ ولیحلفن ان اردنا الا الحسن۔ ان سے پوچھو گے تو یہ قسمیں اٹھا اٹھا کر کہیں گے کہ ہمارا منشاء تحریک کی بھلائی کے سوا کچھ نہیں والله يشهد انهم تكذٰبون (۹/۱۰۷) لیکن خدا اس کی شہادت دیتا ہے کہ یہ سخت جھوٹے ہیں۔ چنانچہ اس مسجد کے متعلق حضورؐ کو حکم ملا کہ لا تقم فيه ابداً (۹/۱۰۸) تم اس میں قدم تک بھی نہ رکھنا۔ اس مسجد کی بنیاد ریت کے ایسے ٹیلے پر رکھی گئی ہے جو اسے جہنم کے گڑھے میں لے کر گرے گا اور وہ جہنم کیا ہے؟ یہ کہ الا يزال بنيانهم الذى بنوارية فى قلوبهم الا ان تقطح قلوبهم (۹/۱۱۰) اس مسجد کی تعمیر ان کے دل میں پھانس بن کر کھٹکتی رہے گی اور اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دے گی۔ چنانچہ اس مسجد کے متعلق تاریخ میں ہے کہ حضورؐ نے صحابہؓ کو بھیج کر اسے گرا دیا۔

اتنا عرصہ ساتھ رہے

جب اس قسم کے فتنہ پرور عناصر کے خلاف کوئی قدم

اٹھایا جائے تو اکثر لوگ کہتے ہیں کہ یہ لوگ اتنا لمبا عرصہ آپ کے ساتھ رہے۔ اس وقت تو آپ نے ان کے خلاف کچھ نہ کہا۔ اب انہیں منافق اور متفنی بتایا جا رہا ہے۔ آپ کو پہلے کیوں نہ پتہ چلا کہ یہ منافق ہیں۔ لیکن آپ ذرا اس حقیقت پر غور کیجئے کہ حضورؐ نبی اکرم کی بصیرت سے بڑھ کر دنیا میں کس کی بصیرت ہو سکتی ہے؟ پھر حضورؐ کے ساتھ صحابہ کبارؓ کی بھی پوری جماعت تھی۔ لیکن اس کے باوجود ہوا کیا؟ یہ فتنہ پرور لوگ حضورؐ کے ہاتھ پر اسلام لاتے اور اس جماعت کے اندر رہتے سہتے تھے۔ ان کے معاشرے کا ایک جزو تھے۔ لیکن سوچئے کہ ان لوگوں کو پہچاننے اور جماعت سے نکالنے میں کتنا وقت لگا۔ حضورؐ کی مدنی زندگی کی کل مدت دس سال کی تھی۔ اور غزوۂ تبوک حضورؐ کی حیات طیبہ کی آخری مہم تھی۔ جو ۹ھ میں واقع ہوئی تھی۔ یہ منافقین غزوۂ تبوک تک میں شامل تھے۔ اس کے بعد ان کے استیصال کلی کا انتظام کیا گیا۔ یعنی حضورؐ اور جماعتِ صحابہؓ کو ان منافقین کی آخری پہچان کے لئے نو سال کا عرصہ لگ گیا۔ خدا نے کہہ دیا تھا کہ ہم وحی کے ذریعے ان کی نشاندہی نہیں کرنا چاہتے کہ تم ان کی پیشانیوں سے ان کے دل کی حالت معلوم کر لو۔ یہ چیز تمہیں ان کے اقوال و افعال اور اعمال و کردار ہی سے معلوم کرنی ہوگی۔ سورہ محمدؐ میں ہے ولو نشآء لا رینٰکھم فلعر فتھم بسیمھم و لتعر فنھم فی لحن القول (۴۷/۳۰)۔ اور اعمال و کردار سے پہچاننے میں اتنا لمبا عرصہ لگ گیا اور اس عرصہ میں یہ لوگ جس قدر خرابی کا موجب بنتے رہے' قرآن کے اوراق اس پر شاید ہیں۔ لہٰذا کسی کا یہ کہنا کہ یہ لوگ اتنا لمبا عرصہ تمہارے ساتھ رہے۔ تم نے پہلے کیوں نہ کہا کہ یہ منافق ہیں' حقائق سے بے خبری کی دلیل ہے۔

منافقین کے خلاف جنگ

اس مقام پر پہنچ کر اس گروہ کے متعلق حکم آیا ہے کہ یایھا النبی جاھد الکفار و المنٰفقین واغلظ علیھم (۹/۷۳) اے رسول! کفار اور ان منافقین کو ایک ہی صف میں شمار کرو۔۔ ان کے خلاف جنگ کرو۔۔ اور ان سے بڑی سختی کا سلوک کرو۔ غور کیجئے! وہی رسول جن کی امتیازی خصوصیت یہ بتائی گئی تھی کہ فبما رحمۃ من اللہ لنت لھم ولو کنت فظا غلیظ القلب لا نفضوا من حولک (۳/۱۵۸)۔ ''یہ خدا کی رحمت تھی کہ تو ایسا نرم دل واقع ہوا ہے۔ اگر تو دل کا سخت ہوتا تو یہ لوگ تیرے ارد گرد سے بکھر جاتے۔'' یعنی جس رسول کے متعلق یہ کہا گیا تھا کہ وہ ''غلیظ القلب'' نہیں اب اسی سے کہا جا رہا ہے کہ واغلظ علیھم۔ اس پر ان لوگوں کو بھی غور کرنا چاہئے جو نہایت ہمدردانہ انداز میں کہا کرتے ہیں کہ انسان کو سخت دل نہیں ہونا چاہئے اور اپنے رفقاء کے ساتھ اس قسم کا سلوک نہیں کرنا چاہئے۔ نہ تو رسولؐ اللہ سے زیادہ کوئی نرم دل ہو سکتا ہے اور نہ ہی ان ''ساتھیوں'' سے زیادہ لمبے عرصہ کا کوئی ساتھی۔ حقیقت یہ ہے کہ جس انگلی کے زخم کا علاج مرہم سے نہ ہو سکتا ہو اور وہ ناسور بنتا جا رہا ہو جس سے باقی جسم کے زہر آلود ہو جانے کا خطرہ ہو' اسے بالآخر کاٹ کر الگ کرنا پڑتا ہے۔ یہ ڈاکٹر کی سنگدلی نہیں ہوتی۔ علاج کا تقاضا ہوتا ہے۔ اس رسولؐ سے یہی نہیں کہا گیا کہ وہ ان سے جنگ کرے۔ یہ بھی کہا گیا کہ ان سے ہر قسم کے معاشرتی تعلقات منقطع کر لے۔

معاشرتی تعلقات کا انقطاع

معاشرتی تعلقات میں کسی کی موت پر تعزیت اور دعائے خیر آخری چیز ہوتی ہے۔ ان لوگوں کے متعلق حکم دیا گیا کہ لا تصل علی آحد منهم مات ابداً ولا تقم علیٰ قبره (۹/۸۴) اگر یہ مر جائیں تو ان کے لئے دعائے خیر نہ کرو۔ کبھی نہ کرو۔ نہ ہی ان کی قبر پر کھڑے ہو۔ یوں اس گروہ سے جماعت مومنین پاک اور صاف ہوئی۔ جماعت مومنین سے اس کا وعدہ کیا گیا تھا کہ تم میں سے بالآخر خبیث اور طیب الگ ہو کر رہیں گے۔ ما کان لیذر المومنین علیٰ مآ انتم علیه حتیٰ یمیز الخبیث من الطیب (۳/۱۷۸) یہ ہو نہیں سکتا کہ خدا جماعت مومنین کو اسی حالت میں چھوڑ دے جس میں یہ اب ہے۔ وہ رفتہ رفتہ ایسا کرے گا کہ خبیث اور طیب چھٹ کر الگ الگ ہو جائیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ نبی اکرمؐ کی وفات کے وقت جماعت مومنین میں کوئی منافق نہیں رہا تھا۔ سب کٹ کر یا چھٹ کر الگ ہو چکے تھے۔

پارٹی کا ساتھ

بہر حال میں کہہ یہ رہا تھا کہ منافقین کو پہچاننے میں اتنا وقت لگتا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک بات اور بھی پیش نظر رکھنی چاہئے۔ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ خود تو بدفطرت نہیں ہوتے لیکن وہ پارٹی بازی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یعنی وہ دل سے مانتے ہیں کہ ہماری پارٹی غلطی کر رہی ہے لیکن ان میں اتنی جرأت نہیں ہوتی کہ وہ پارٹی کا ساتھ چھوڑ دیں۔ اس لئے وہ ان تمام فتنہ سامانیوں میں منافقین کا ساتھ دیتے ہیں اور اسی وجہ سے تخریب کے جرم میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے پارٹی بازی کو لعنت قرار دیا ہے۔ وہ تو اس باب میں اس حد تک جاتا ہے کہ اس جماعت میں شامل ہونے والوں سے کہتا ہے کہ یایها الذین امنوا لا تتخذوا ابآء کم و اخوانکم اولیاء ان استحبوا الکفر علی الایمان ۔ اے ایمان والو! اگر تمہارے ماں باپ اور بہن بھائی بھی ایمان کے مقابلہ میں کفر کو زیادہ عزیز رکھیں تو تم انہیں بھی اپنا دوست مت بناؤ و من یتولهم منکم فاولٰک هم الظلمون (۹/۲۳) جو کوئی تم میں سے انہیں اپنا دوست بنائے گا تو اس کا شمار بھی انہی ظالموں کے زمرے میں ہوگا۔ قل ان کان اٰبآئوکم و ابناء کم و اخوانکم و ازواجکم و عشیرتکم و اموال ٥ اقتر فتموها و تجارة تخشون کسادها و مسٰکن ترضونها احب الیکم من الله و رسوله و جهاد فی سبیله فتر بصوا حتی یاتی الله بامره والله لا یهدی القوم الفٰسقین (۹/۲۴)۔ اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ اگر تمہارے ماں باپ یا اولاد۔ تمہارے بہن بھائی یا بیویاں۔ تمہارے دیگر اہل خاندان۔ تمہارے مال و دولت، جسے تم اس محنت سے کماتے ہو۔ تمہاری تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے تم ڈرتے ہو۔ تمہارے مکانات جنہیں تم نے اپنی پسند سے بنوایا ہے۔ غرضیکہ دنیا کا کوئی رشتہ اور کوئی جاذبیت خدا اور رسولؐ اور اس کے راستے میں جہاد کے مقابلہ میں تمہیں زیادہ محبوب ہیں، تو تم انتظار کرو یہاں تک کہ تمہارے متعلق خدا کا آخری فیصلہ آ جائے۔ یاد رکھو! جو لوگ صحیح راستے کو چھوڑ کر کسی اور طرف نکل

جاتے ہیں وہ اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتے۔ یہ خدا کا اٹل قانون ہے۔

یہ ہے برادران عزیز! ایمان کا تقاضا اور خدا کا فیصلہ۔ کس قدر صحیح کہا تھا مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے کہ

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

☆☆☆☆☆☆☆☆

یہ مقام انسانی کیریکٹر کی بہت بڑی آزمائش کا ہوتا ہے۔ ہم اپنی دانست میں یہ سمجھتے ہیں کہ نیک آدمی وہ ہے جو کسی کو برا نہ کہے۔ جو کسی کا دل نہ دکھائے۔ ایسے آدمی کی سب تعریف کرتے ہیں۔ لیکن قرآن کی رو سے نیک آدمی کا فریضہ اس سے کہیں آگے ہے۔ اور وہ ہے نہی عن المنکر۔ غلط بات سے دوسروں کو روکنا اور یہ ظاہر ہے کہ کسی سے یہ کہنا کہ وہ غلط راستے پر چل رہا ہے، اور اسے اس راہ سے روکنے کی کوشش کرنا، اس سے عداوت مول لینا ہے۔ اس کے نزدیک بہت برا بننا ہے۔ اگر کوئی شخص اس طرح برا بننے کے لئے تیار نہیں ہوتا تو وہ اپنے آپ کو مومن نہیں کہلا سکتا۔ خدا کی میزان میں اس کی ایسی نیکیوں کا پرکاہ جتنا بھی وزن نہیں جن سے مقصود یہ ہو کہ اسے سب اچھا جانیں۔ جب مومن کا فریضہ یہ ٹھہرا کہ وہ غلط کار کو غلط کاری سے روکے تو اسے غلط کاروں کی دنیا میں برا بننے کے لئے ہر وقت تیار رہنا چاہیئے۔ اسلامی معاشرہ میں (Neutral) یا (Indifferent) کا کوئی مقام نہیں۔ یہاں تو یا خدا کا بندہ بن کر رہنا ہوگا یا طاغوت کا۔ جس میں برائی کو روک کر برا بننے کی ہمت نہیں اس کے لئے اس سے بہتر نصیحت کوئی نہیں کہ

جا بیٹھ کسی غار میں ۔۔۔ اللہ کو کر یاد

مرض کا علاج

میں نے شروع میں کہا تھا کہ قرآن کریم نے منافقت کو ''دل کا مرض'' قرار دیا ہے۔ یعنی (Egoism) دوسری طرف اس نے اپنے متعلق کہا ہے کہ وہ شفاء لما فی الصدور ہے (۱۰/۵۷) یعنی دل کی بیماریوں کا علاج۔ سوال یہ ہے کہ قرآن کریم اس مرض کا علاج کیا بتاتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر مرض کو اس کے ابتدائی منازل میں پکڑ لیا جائے تو علاج آسان ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن نے کہا ہے کہ اگر یہ لوگ اپنی روش سے توبہ کر کے صحیح راستہ اختیار کرلیں تو ان کے لئے بہتر ہے۔ فان یتوبوا یک خیر الھم (۹/۷۴) اس سلسلہ مین قرآن انہیں ایک بات سمجھاتا ہے اور وہ بات بڑی اہم ہے، وہ ان سے کہتا ہے کہ تم عزت کے بھوکے ہو۔ تم یہ تمام حرکات اس لئے کر رہے ہو کہ تم سے عزت کا مقام چھن گیا ہے۔ یہی تمہارا مرض ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ تمہیں پھر سے عزت کا مقام حاصل ہو جائے۔ اس کے لئے تم اپنے ذہن سے یہ نسخہ تجویز کرتے ہو کہ اس جماعت کی تخریب سے تمہیں عزت اور نمود حاصل ہو جائے گی۔ لیکن یہ غلط ہے۔ تم نے درحقیقت اپنے متعلق صحیح اندازہ نہیں لگایا۔ تم نے سمجھا کہ اس تحریک کو تمہاری وجہ سے عزت حاصل ہے اور جب تم اس سے الگ ہو کر اس کی تخریب کرو گے تو اس کی عزت چھن جائے گی اور تمہیں عزت مل جائے گی۔ یہ ہے تمہارا اپنے متعلق وہ غلط اندازہ جس کی وجہ سے تم جہنم کے عذاب میں مبتلا ہو۔ یاد رکھو۔ و للہ العزۃ و لرسولہ و

للمومنين ولٰكن المنٰفقين لا يعلمون (۶۳/۸)۔ عزت تو اس تحریک کے ساتھ وابستگی اور اس جماعت کی رفاقت ہی سے حاصل ہو سکے گی۔ جب تک تم اس حقیقت کو نہیں سمجھ لیتے تمہارے دل کا روگ دور ہو نہیں سکتا۔ تمہارا یہی روگ تھا جس کی وجہ سے تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ تم نے اس تحریک کا ساتھ دے کر اس پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔۔۔ يمنون عليك ان اسلموا (اے رسول! یہ تم پر احسان دھرتے ہیں کہ اسلام لا کر تمہارے ساتھ شامل ہو گئے)۔ اگر تمہارے دل میں للّٰہیت ہوتی تو تم یہ سمجھتے کہ اس تحریک نے تم پر احسان کیا ہے جو تمہیں زندگی کا صحیح راستہ مل گیا۔ قل لا تمنوا على اسلامكن بل الله يمن عليكم ان هدٰكم للايمان ان كنتم صٰدقين (۴۹/۱۷)۔ (ان سے کہہ دو کہ تم اپنی اسلام سے مجھ پر احسان مت جتلاؤ۔ تمہارا اسلام پر احسان نہیں۔ بلکہ تم پر خدا کا احسان ہے کہ اس نے ایمان کی شمع نورانی سے تمہاری زندگی کی راہیں روشن کر دیں۔ اگر تمہارے دل میں صداقت ہوتی تو تم احسان جتلانے کے بجائے اپنے آپ کو زیر بار احسان محسوس کرتے اور اس صورت میں تمہارے دل کی کیفیت شکر گذاری کی ہوتی نہ کہ شکوہ طرازی کی۔۔ وہ ان لوگوں کو یہ کچھ سمجھاتا ہے تاکہ وہ اپنا اور اس تحریک کا صحیح مقام سمجھ لیں۔ لیکن جن لوگوں کا مرض، علاج کی حد سے آگے بڑھ چکا ہو وہ ان سے کہتا ہے کہ موتوا بعيضكم (۳۳/۱۱۸) یاد رکھو! اگر تم انہی خیالات میں غرق رہے تو تم اپنے غصے کی آگ میں بھسم ہو کر خود ہی مر جاؤ گے۔ کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔ یہ ہے وہ عبرت انگیز انجام جو ایسی ذہنیت رکھنے والے لوگوں کا ہوتا ہے۔ ایسا عبرت انگیز کہ فما بكت عليهم السماء و الارض۔ (۴۴/۲۹)۔ پھر ان پر نہ آسمان رویا اور نہ زمین کی آنکھ سے کوئی آنسو ٹپکا۔

احتیاطی تدابیر

یہ ہے برادران عزیز! وہ گروہ جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ ان سے محتاط رہنے کی بڑی ضرورت ہے۔ اس کے لئے صحیح تدبیر یہ ہے کہ جو شخص آپ کی تحریک کا رکن بننا چاہے اس کے متعلق حتی الامکان تحقیق کر لی جائے کہ وہ کس ذہنیت کا انسان ہے۔ یہ اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ آپ ہر اس شخص کو جو آپ کے فارم ممبری پر دستخط کر دے، ممبر بنا لیں اور بعد میں اسے رکنیت سے خارج کرنا پڑے۔ خارج ہونے والا کبھی اس بات کا اعتراف نہیں کرے گا کہ اس کا اخراج اس کی کسی غلطی، کمی یا لغزش کی وجہ سے عمل میں آیا ہے (الا ماشاءاللہ) وہ سارا الزام تحریک اور اس کے ارباب بست و کشاد کے سر دھرے گا اور اپنے آپ کو سچا ثابت کرنے کے لئے جگہ جگہ پراپیگنڈہ کرتا پھرے گا۔۔ پھر لوگوں کی ذہنیت بھی عجیب ہے۔ زندگی میں آپ کے بیسیوں دوست بنتے ہیں اور ان میں سے کتنے ایسے ہوتے ہیں جن سے کچھ وقت کے تجربہ کے بعد آپ کے تعلقات باقی نہیں رہتے۔ انہیں اپنے دوستوں کے حلقہ سے خارج کرنے میں آپ اپنے آپ کو کبھی موردِ الزام قرار نہیں دیتے۔ لیکن اگر کوئی تحریک، انہی حالات میں کسی کو اپنی حلقہ سے خارج کر دیتی ہے تو آپ اس شخص کو نہیں، بلکہ تحریک کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں۔ اگر آپ شروع ہی میں اس کا محاسبہ کر لیں اور اسے اپنی جماعت کا رفیق بننے کا اہل نہ سمجھیں تو

اس کے لئے آپ کے خلاف کسی پراپیگنڈہ کی گنجائش نہیں ہوگی۔ بلکہ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی اصلاح کر کے آپ کے ساتھ شامل ہونے کے قابل بن جائے۔ یاد رکھئے! آپ کی تحریک، سیاسی جماعتوں جیسی نہیں، جن میں ساری نظر ارکان کی تعداد پر ہوتی ہے۔ آپ تعداد کی کثرت پر بالکل نہ جائیے۔ دس مخلص قرآنی دوست، سو مفسدین اور ہزار مذبذبین سے بہتر ہیں۔ اور اخلاص کا معیار ایک ہی ہے۔ یعنی الٰہیت جس کا ذکر میں نے شروع میں کیا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ان لوگوں کے سامنے صرف ایک مقصد ہو اور وہ یہ کہ قرآنی فکر سے وابستگی کے بعد میرے اپنے اندر کس قدر تبدیلی پیدا ہوگی اور میری اس رفاقت سے اس آواز کے آگے بڑھنے میں کسی حد تک مدد ملے گی۔ قرآنی تحریک میں تو شامل ہونے کا اہل ہی وہ ہے جس کا یہ ایمان ہو کہ۔

عشق میں ایک تم ہمارے ہو
باقی جو کچھ ہے سب تمہارا ہے

☆☆☆☆☆☆☆☆

غریب لوگ

قرآنی دعوتِ انقلاب کے سلسلہ میں ایک بات اور بھی سامنے آتی ہے، اور وہ یہ کہ اس دعوت پر سب سے پہلے غریبوں کی جماعت لبیک کہتی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم، اس دعوت کی سب سے پہلی آواز کو سامنے لاتے ہی اس حقیقت کو نمایاں طور پر سامنے لایا ہے۔ جب حضرت نوحؑ نے قوم کے دولت مند طبقہ کے سامنے دعوت کو پیش کیا تو انہوں نے اعتراض ہی یہ کیا کہ ہم تمہاری جماعت میں کس طرح شامل ہو جائیں جبکہ حالت یہ ہے کہ وما نرٰك اتبعک الا الذین هم اراذلنا۔ اس جماعت میں جو لوگ شامل ہوئے ہیں وہ ہمارے معاشرہ کے نہایت ادنیٰ درجے کے کمین لوگ ہیں۔ بادی الرایی۔ ان کی شکل وصورت سے ظاہر ہے کہ وہ کس حیثیت کے مالک اور کس عقل وفکر کے حامل ہیں۔ وما نریٰ لکم علینا من فضل (۱۱/۲۷)۔ کچھ اونچے طبقہ کے لوگوں کی جماعت ہوتی تو ہم اس میں شامل بھی ہو جاتے۔ آپ ان لوگوں کو جماعت سے نکال دیجئے۔ پھر ہم آپ کے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔ ان لوگوں سے آپ کو ملے گا کیا! ان کے اس مطالبہ اور اعتراض کے جواب میں حضرت نوحؑ نے جو کچھ کہا وہ غور سے سننے کے قابل ہے۔ آپ نے فرمایا۔ وما علمی بما کانوا یعملون۔ مجھے کچھ علم نہیں کہ یہ لوگ کیا کام کرتے ہیں۔ نہ ہی مجھے ایسا کچھ معلوم کرنے کی ضرورت ہے۔ مجھے تو اتنا ہی معلوم ہے کہ یہ قلب سلیم لے کر حاضر ہوئے ہیں اور میزان خداوندی میں وزن، مال و دولت کا نہیں، قلب و نگاہ کا ہوتا ہے۔ تمہاری نگاہ اپنی دولت اور وجاہت پر ہے اور خدا کی نگاہ ان کے خلوص اور حسنِ نیت پر۔ اللہ اعلم بما فی انفسهم (۱۱/۳۱)۔ لہٰذا وما انا بطارد الذین امنوا۔ میں تمہاری خاطر ان مفلسوں اور غریبوں کو دھتکار نہیں سکتا۔ میں اگر تمہارے پاس خاطر سے، انہیں نکال دوں تو انہم ملٰقوا ربهم (۱۱/۲۹) یہ جب خدا کے حضور اس کی شکایت کریں گے تو میں اس کا کیا جواب دوں گا۔ اس لئے تمہارا مال و دولت تمہیں مبارک۔ میرے لئے یہی مفلس و نادار دنیا کی سب سے بڑی متاع ہیں۔

اور یہی وہ شکایت تھی جو سردارانِ قریش کو نبی اکرمؐ کے

خلاف تھی اور جسے (علامہ اقبال مرحوم کے الفاظ میں) ابوجہل نے غلافِ کعبہ کو تھام کر اپنے خداؤں کے حضور باصدر آہ وفغاں' ان الفاظ میں پیش کیا تھا کہ۔

مذہبِ او قاطعِ ملک و نسب
از قریش و منکر از فضلِ عرب
در نگاہِ او یکے بالا و پست
با غلام خویش بریک خواں نشست
قدرِ احرارِ عرب نشناختہ
با کُلفتانِ حبش در ساختہ
احمراں با اسوداں آمیختند
آبروئے دودمانے ریختند

عبس وتولیٰ

یہی وہ بنیادی حقیقت ہے جس کی طرف قرآن کریم نے' آسمانی انقلاب کے ہر داعی کی توجہ سورۂ عبس کے تمثیلی انداز میں منعطف کرائی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ داعی الی القرآن کی کیفیت یہ نہیں ہونی چاہئے کہ عبس وتولیٰ ان جاء ہ الاعمیٰ اس کے پاس ایک غریب اندھا آیا تو اس نے تیوری چڑھالی اور منہ پھیر لیا۔ وما یذریک لعلہ یزکیٰ۔ اس سے کوئی پوچھے کہ تجھے کیا معلوم کہ قرآن کی تعلیم اس کی کس قدر نشوونما کر دیتی۔ او یذکر فتنفعہ الزکریٰ۔ یا وہ اسے سن لیتا تو یہ اس کے لئے کچھ نہ کچھ فائدہ کا موجب ہو جاتی۔ لیکن تو ایسے لوگوں کو چھوڑ کر ان لوگوں کو زیادہ مستحق توجہ سمجھتا ہے من استغنیٰ قانت لہ تصدی۔ جو اپنے آپ کو تجھ سے' تیری دعوت سے' اس قرآن کی فکر سے' مستغنی سمجھتے ہیں۔ تو چاہتا ہے کہ ایسے لوگوں کو پکڑ پکڑ کر مومن بنائے حالانکہ تجھ پر اس کا کچھ الزام نہیں آئے گا کہ ایسے لوگ حق وصداقت کی راہ پر کیوں نہیں آئے۔ تو ان لوگوں کے تو پیچھے بھاگتا ہے۔ و اما من جاء ك لیسحیٰ و ھو یخشیٰ فانت عنہ تلھیٰ۔ اور جو خود دوڑتا ہوا تیری طرف آتا ہے اور زندگی کی خطرناک گھاٹیوں کا خیال دل میں لئے ہوئے آتا ہے۔ تو اس سے لاپرواہی برتتا ہے۔ حالانکہ یہی وہ لوگ ہیں جو فی الحقیقت تیری توجہ کے مستحق ہیں۔ کلا انھا تذکرۃ۔ یہ تمثیلی بیان ایک بہت بڑی حقیقت کی یاددھانی کراتا ہے۔ فمن شاء ذکرہ (۱۲۔۱/۸۰)۔ سو جس کا جی چاہے اس فراموش کردہ حقیقت کو اپنے سامنے لے آئے۔ یہ ہے وہ عظیم نکتہ جس کی یاددہانی' قرآن' ان لوگوں کو کراتا ہے جو اس دعوت کو لے کر اٹھیں۔ لہٰذا برادرانِ عزیز! آپ کی حقیقی متاع یہی غریب و نادار سے رفیق ہیں جن میں اکثر کے پاس' اس سردی میں جسم ڈھانپنے کے لئے گرم کپڑے بھی نہیں۔ لیکن جن کے سینے میں ایسا گرم دل ہے جس کی حرارت' موم کے بنے ہوئے بڑے بڑے مہیب ''خداؤں'' کو پگھلا کر رکھ دیتی ہے اور وہ بھی ہیں جن کے پاس آپ کی اس محفل تک پہنچنے کے لئے ریل کا کرایہ تک بھی نہیں ہوتا لیکن وہ یہ کہتے ہوئے' مستانہ وار یہاں پہنچ جاتے ہیں کہ

بے دست و پا نیم کہ ہنوز از دفور عشق
سود است در سرم کہ بہ سامان برابر است

لہٰذا میرے عزیز بھائیو! لا تمدن عینیک الی ما متعنابہ (۱۴/۸۸) تم ان مفاد پرستوں کے مال ودولت کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھو اور اپنی توجہ اپنے ان نادار لیکن مخلص

رفیقوں پر مرکوز کرو جو آپ کی حقیقی متاع ہیں۔

بہ چشم کم منگر عاشقانِ صادق را
کہ ایں شکستہ بہایاں، متاعِ قافلہ اند

اپنے اندر تبدیلی

میرا مطلب یہ نہیں کہ آپ کی تحریک کو آگے بڑھنے کے روپے پیسے کی ضرورت نہیں۔ نہ ہی میرا مطلب یہ ہے کہ مال و دولت والوں میں مخلص اور وفا شعار ہوتے ہی نہیں۔ انہی میں عثمان غنی جیسے بھی تو ہوتے ہیں۔۔۔ میرا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ دل کی صداقت اور خلوص کی بنا پر نہیں بلکہ محض مالی امداد کے سہارے تحریک میں نمایاں مقام حاصل کرنے کے لئے شامل ہوں، وہ تحریک کے لئے ہمیشہ نقصان کا موجب ہوں گے آپ کی تحریک میں معیار فضیلت، تقویٰ ہونا چاہئے۔۔۔ یعنی خلوصِ قلب کے ساتھ فرائض منصبی کی ادائیگی۔۔ نہ کہ مال و دولت اور جاہ حشمت۔ آپ یہ نہ دیکھئے کہ کسی کے پاس کیا ہے۔ یہ دیکھئے کہ وہ خود کیا ہے! لکل درجٰت مما عملوا (۴۶/۱۹) آپ کا بنیادی معیار ہونا چاہئے۔ آپ کی تو تحریک کا مقصد ہی یہ ہے کہ قرآنی تعلیم کی رو سے آپ کے اپنے اندر تبدیلی کس قدر پیدا ہوئی ہے۔ اس لئے آپ کے ہاں عزت اور فضیلت ماپنے کا معیار ہی ''تبدیلی'' ہونا چاہئے نہ کہ خارجی مقبوضات۔ میں نے اس مرتبہ کھلے اجلاس میں اپنے ایک خطاب کا موضوع یہ رکھا ہے کہ ''مومن کسے کہتے ہیں'' آپ اسے بغور دیکھئے اور پھر اس کی روشنی مین اپنا محاسبہ کرتے رہئے کہ آپ کے اندر کس قدر تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔ اگر آپ کے اندر قرآنی زاویہ نگاہ سے تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تو پھر، میرے عزیز دوستو! نہ آپ کو قرآنی فکر کا سمجھنا کچھ فائدہ دے سکتا ہے اور نہ اس تحریک کے ساتھ وابستگی کچھ مفید ہو سکتی ہے۔۔ اور جب میں ''آپ'' کہتا ہوں تو اس کے اندر اپنے آپ کو سب سے پہلے شامل کرتا ہوں۔ اس داخلی تبدیلی کے بغیر یہ آپ کے اجتماعات و تقاریب۔ آپ کے درس اور تقاریر، کھیل تماشہ سے زیادہ کچھ نہیں۔ قرآن کے الفاظ ہیں۔ و لـــن سالتهم لیقولن انما کنا نخوض و نلحب (۹/۶۵) جن لوگوں کے متعلق آپ کو شکایت ہوتی ہے کہ وہ تحریک کے اندر ہوتے ہوئے بھی تحریک کا ساتھ نہیں دیتے بلکہ الٹا تخریب کا موجب بنتے رہتے ہیں، یہ وہی ہیں جو اس تمام جدوجہد کو محض کھیل تماشہ سمجھتے ہیں۔ و لما یدخل الایمان فی قلوبکم (۴۹/۱۴)۔ قرآن ان کے حلق سے نیچے اترا ہی نہیں ہوتا۔ اگر قرآن دل کی گہرائیوں میں اتر جائے تو یہ ناممکن ہے کہ اس شخص کے دماغ میں کوئی خیال بھی ایسا آنے پائے جو قرآنی تحریک کے لئے نقصان کا موجب ہو۔ اس لئے برادرانِ گرامی قدر! آپ تھوڑی دیر کے لئے رُکئے اور اپنے اپنے دل کو ٹٹولئے کہ قرآن آپ کے دل میں اتر چکا ہے یا نہیں۔ قرآن دل میں اتر جائے تو پھر یہ ساری کائنات بدل جاتی ہے۔ پھر تو کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو میکدہ سے تو دنیا بدل گئی

قرآنی دعوت کی اہمیت

رفیقانِ محترم! یوں تو اس تیرہ سو سال کے عرصہ میں

کونسا زمانہ ایسا تھا جس میں قرآنی دعوت کو عام کرنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ ضرورت جس قدر شدید ہمارے دور میں آ کر ہوتی ہے، ایسی شدت اس نے اس سے پہلے شاید ہی کبھی اختیار کی ہو۔ آج ایک طرف تو یہ کیفیت ہے کہ ساری دنیا سمٹ کر گویا ایک بستی بن گئی ہے اور دوسری طرف زمانہ وہ آ گیا ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا تھا کہ کان شرہ مستطیرا (٧٦/٧) جس میں فساد کی چنگاریاں چاروں طرف پھیل رہی اور اڑ اڑ کر دوسروں کو لگ رہی ہوں گی۔ اس حشر آسا افراتفری اور قیامت نما نفسانفسی میں ظاہر ہے کہ زندگی کے بلند مقاصد کی طرف توجہ دینے کی فرصت کسے ہوگی۔ ایسے عالم میں جبکہ

کسی کو رنگ سے مطلب کسی کو خوشبو سے
گلوں کے چاکِ گریباں کی بات کون کرے

لیکن عزیزانِ من! یہی تو وہ وقت ہے جب قرآن کی آواز بلند کرنے والوں کی ہمتوں کی آزمائش ہوتی ہے۔ اس وقت ساری دنیا میں قرآن خالص کی آواز صرف آپ کی اس ننھی سی جماعت کی طرف سے بلند ہو رہی ہے۔ اس لئے آپ کی ذمہ داریاں بڑی عظیم اور آپ کی کوششوں کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا ہے۔ دنیا اپنے مختلف تجارب کو آزما چکی ہے۔ اسے نجات وسعادت کی راہ کہیں نظر نہیں آئی۔ انسانوں کے خود ساختہ نظریاتِ زندگی اور نظامہائے حیات میں یہ راہ نظر آ ہی نہیں سکتی۔ یہ صرف قرآن کی شمعِ نورانی ہے جو شب تیرہ وتار میں، راہ گم کردہ مسافروں کو سراغِ منزل دے سکتی ہے۔ سوچئے کہ اگر قرآن کی موجودگی میں انسانیت اس طرح سرگرداں وحیراں پھرے تو اسکی ذمہ داری کس کے سر عائد ہوگی؟ وقت ہے کہ آپ اُٹھئے اور قرآن کے باب عالی پر دستک دے کر پکاریئے کہ

گھٹا اٹھی ہے تو بھی کھول زلفِ عنبریں ساقی
تیرے ہوتے فلک سے کیوں ہو شرمندہ زمیں ساقی

آپ دستک دیجئے اور پھر دیکھئے کہ وہ نورانیت کا پیکر ساقیِ ازل کس طرح کوثر بدوش و جنت بداماں وجۂ شادابیٔ عالم بنتا ہے۔ آپ نے ایک ''تجارت'' تو ابوالہوسوں کی دیکھی ہے جس کا ذکر شروع میں کیا جا چکا ہے اور جس کے متعلق، قرآن نے کہا ہے کہ ان کی تجارت انہیں کوئی فائدہ نہ دے سکی اور ایک تجارت وہ ہے جس کے متعلق آپ کا خدا یہ کہتا ہے کہ یاٰیھا الذین اٰمنوا ھل ادلکم علیٰ تجارۃ تنجیکم من عذاب الیم۔ اے ایمان والو! کیا میں تمہیں ایک ایسی تجارت کی نشاندہی کروں جو تمہیں دردانگیز عذاب سے بچا لے! تومنون باللہ و رسولہ و تجاھدون فی سبیل اللہ باموالکم وانفسکم۔ ذالکم خیر لکم ان کنتم تعلمون (٦١/١٠-١١) تم خدا اور اس کے رسول پر اس طرح ایمان لاؤ کہ وہ تمہارے دل کی گہرائیوں میں اتر جائے۔ اور پھر خدا کے راستے میں اپنی جان و مال سے مسلسل جدوجہد کرتے رہو۔ اگر تم حقیقت کا علم رکھتے ہو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ سودا تمہارے لئے بہت نفع بخش ثابت ہوگا۔ یہی وہ تجارت ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ لن تبور (٣٥/٢٩) اس میں کبھی نقصان نہیں ہوگا یہ سودا گھاٹے کا ہے ہی نہیں۔ اس سے تم کبھی تباہ نہیں ہو گے۔ لہٰذا برادرانِ عزیز! آپ کو اس تجارت میں اپنا ''سرمایہ'' لگانا چاہئے۔ اس کا منافع روپے پیسے یا جھوٹی عزت اور تسکینِ پندار کی شکل میں

نہیں ملتا۔ یہ ملتا ہے انسانی ذات کی نشو ونما کی شکل میں۔ اور جسے یہ منافع مل جائے اس کی تجارت کے نفع بخش ہونے میں کسے کلام ہوسکتا ہے! دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ احباب کی ہمتوں میں برکت۔ ارادوں میں استقامت۔ عزائم میں رسوخ اور قدموں میں ثبات عطا فرمائے۔ اور آپ کو من شر النفٰثٰت فی العقد۔ و من شر حاسد اذا حسد۔ من شر الواسواس الخناس الذی یوسوس فی صدور الناس سے ہر مقام پر محفوظ رکھے۔

جہاں تک میرا اپنا تعلق ہے' یوں تو میری زندگی کی ہر سانس پہلے بھی اس مقصد لئے وقف تھی لیکن جب سے مجھے (سابقہ اپریشن کے بعد) گویا زندگی کی توسیع (Extension) ملی ہے' یہ احساس اور بھی شدید ہو گیا ہے کہ مشیت نے ہنوز مجھ سے کچھ اور کام لینا ہے۔ لیکن یہ کام' میرے عزیز ہم سفرو! آپ کی رفاقت کے بغیر تکمیل تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔ اس لئے آپ اپنی رفتار کو اور ذرا تیز کر دیجئے۔ تیز ترک گام زن' منزل ما دور نیست۔ میری دعا تو قرآن کی بارگاہ میں ایک ہی ہے کہ۔

روزم تو برر فروز و شیم را تو نور دِہ
ایں کارِ تست۔ کارِ مہ و آفتاب نیست

آخر میں برادرانِ عزیز! میں بخلوص قلب آپ کا سپاس گزار ہوں کہ آپ نے اس سردی کے موسم میں اتنے دور دراز مقامات سے زحمتِ سفر گوارا فرما کر اپنی اس ملی اجتماع میں شرکت فرمائی۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے اس جذب و کیف کو دیکھ کر خود میری زندگی بڑھ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ احباب کو خوش و خرم رکھے اور زندگی کے ہر بلند مقصد میں جو قرآن کے مطابق ہو' شاد کام و کامران فرمائے۔

والسلام علیکم۔ برادرانِ عزیز

تحریک و بزم طلوع اسلام

طلوع اسلام کی تحریک ایک فکری تحریک ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ ہنگامے برپا کرنے’ جلسے منعقد کرنے’ جلوس نکالنے’ جذبات کو مشتعل کرنے کی بجائے دل و دماغ کی داخلی تبدیلی سے خود بخود سوسائٹی میں تبدیلی آ جائے۔ قرآن کریم نے اس بنیادی حقیقت کو نہایت خوبصورت الفاظ میں بیان کیا ہے ’’جب تک کوئی قوم اپنی داخلی’ نفسیاتی دنیا میں تبدیلی پیدا نہیں کرتی’ خدا اس کے حالات میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا‘‘ (القرآن 13:11)۔ تحریک سے وابستہ کچھ جذباتی لوگوں کا یہ سمجھ لینا کہ محض چند لیکچروں اور جلسوں سے لوگوں کے نظریات میں تبدیلی پیدا کریں گے’ ایک خوش فہمی ہے۔ قوموں کے نظریات صدیوں میں جا کر مرتب ہوتے ہیں۔ انہیں راتوں رات تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کام جبر اور استبداد سے نہیں ہو گا۔ لوگوں کے قلب و دماغ کو رفتہ رفتہ اس تبدیلی کے لئے آمادہ کرنا ہو گا۔

لہٰذا بزم کے اراکین کا بنیادی کام یہ ہونا چاہئے کہ اپنے حلقہ اثر و رسوخ میں قرآنی پیغام کو عام کرتے جائیں۔

ہمیں ایک احتیاط خاص برتنی چاہئے کہ ہماری اجتماعی کوشش کہیں پارٹی کا رنگ نہ اختیار کر جائے۔ ادارہ کی طرف سے بزموں کی راہنمائی کے لئے قواعد و ضوابط جاری کئے جاتے ہیں اور نمائندہ کا فریضہ ہے کہ وہ بزم کو ان اصولوں کے مطابق چلائے۔ ہر ممبر کے لئے لازمی ہے کہ وہ طلوع اسلام کی طرف سے جاری کردہ ہدایات کی پابندی کرے’ اگر وہ سمجھتا ہے کہ اس کا دائرہ فکر و عمل ان کی وجہ سے تنگ ہو جائے گا تو وہ اپنے لئے کوئی اور میدان عمل اختیار کر لے۔ قرآنی نشر و اشاعت پر صرف طلوع اسلام کی اجارہ داری نہیں ہے۔ ہر کوئی اپنا طریقہ کار اختیار کر سکتا ہے۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ جب تک کوئی شخص طلوع اسلام سے وابستہ ہے اس پر طلوع اسلام کی طرف سے جاری کردہ ہدایات کی پابندی لازمی ہو گی۔

متفرق اقتباسات

از کتاب ’’منزل بہ منزل‘‘

CHAPTER 17

PRAYER

By

G.A. Parwez

Translated by

=====================

In this chapter I propose to tackle one of the most delicate and sensitive issues in the domain of religion, viz a viz prayer, be it in the form of certain rituals of worship, or the act of working a request to the Almighty. It is a sensitive issue because prayer is directly concerned with human sentiments and emotions whereas the Quran suggests the use of reason to tackle life's problems.

Universality of Prayer

Prayer has been an element of humanity ever since the dawn of history. It has been one common characteristic of mankind regardless of time, place, society or philosophy, or the deity involved, or even the rites employed. The incentive for prayer is asking an invisible mighty power for help. Even worship is invariably a prelude to prayer, sacrificial, or other offerings made to a deity are also conditionally accompanied by a request. Prayer is solace for the wronged, support for the weak, hope for the dismayed, shoulder to **cry on** for the hurt and the last chance for the hopeless. The more sentimental, devoted and absorbed a prayer feels, the better are the chances considered for the prayer's success.

That I propose to examine critically such an emotional issue is because the Quran bases its teaching on reason and logic (even metaphysical phenomena like the Hereafter (2/219-220). It guides to the path of God (the truth) those who strive to ponder upon it (29/69).

The Current Concept of Prayer

The prevalent concept of prayer makes it an activity in which God is regarded to do, or give, something. But the Arabic term *Duaa* means to call out to (beckon) someone. As 'calling out' is often for help, the term has also come to be used for seeking, or asking for, requesting, etc.

The Quran often uses the same term for both a currently prevalent erroneous concept as well as the Quranic version of it, for example, Ilaah (to wean an idol as well as Allah) and 'Ibaada' (for reverential worship as well as practical adoption of Allah's law). Similarly, Da'aa, yad'oo, etc., has been used in the meaning of the idolaters calling out to their gods and goddesses for help as well as for a Muslim to obey Allah. Let us first look at instances in the Quran where this particular term and its derivatives have been used to mean 'obedience to Allah', Sura Al-Momin: 'He (Allah) lives and gives life. There is no sovereign but He. So, (call out to and) obey Him alone. Say (Prophet!), I have been forbidden to obey those whom you call (obey) other than Allah. I have been ordered to submit to the preserver of all worlds! (40/65-66). Sura Maryam cites Abraham saying to his people: "And I sever connection with you and also those who call (obey someone) other than Allah! I (only) call (obey) my Preserver!"…. so he severed all connections with those obeyed someone other than Allah … (19/48, 49). Sura Momin: 'Your Preservers say to you: "Call me and I will answer you. Those who transgress My obedience shall enter Hell, humiliated!" (40/60). Sura Toor mentions residents of Paradise answering the query about their deserving the good end by: "Previously (in the worldly life) we used to call (obey) Him." The Messenger was told: "say: 'I only call (obey) my Preserver and do not have any one sharing with Him!" (72/20). Messengers, in general, beckoned: 'and don't call (obey) any other god along with Allah' (25/213; 28/88; 72/18). Sura An'aam clearly says to the Messenger to say to men: After having received such clear guidance, how can I call a god other than Allah? I have been ordered to submit (only) to the Preserver of all worlds!" (6/71).

Da'aa To Mean Petition

Let us now look at the instances where da'aa has been used in the Quran to mean calling out to Allah (for help, guidance, etc.). Before we do that, however, we should look at some of the questions raised by this particular meaning of da'aa.

The belief in an unchangeable pre-destined life renders da'aa simply futile. For example, the pre-written destiny of a dying patient cannot be altered by praying (da'aa) — believing that prayer can alter destiny negates the original belief of unchangeable! Furthermore, this projects God in a strange way — He first decides something (unchangeable destiny) and then waits for prayer by men to change it!

Difficulties also arise with the view that God rules by decree — making decisions as events occur. For example, A (right) and B (wrong) involved in a law suit against one another, both pray to God for success. Obviously, one prayer will be answered. Who is it going to be? A because he is right, or B because he prayed more devotedly? What if A had not prayed at all? If we take the view that A's prayer will be answered because he is in the right (which is contrary to our social experience, anyway), then once again, prayer is rendered pointless. Again, one may take the view that, in order to succeed, prayer must be accompanied by proper action. In that case, will B win despite being wrong and A lose despite being right?

These problems are compounded further by the traditional interpretation of the famous verse from Sura Baqar:

> "(O Messenger!) when My people ask you about Me, tell them that I am close to them; whenever a caller calls I respond with a reply." (2/186)

The problem with this interpretation is our common observation that it doesn't hold time in countless cases of oppressed, poor and down-trodden people around the globe. The traditionalist response to this argument claims that God listens to everyone but decides and does what is really good for the petitioner; therefore, an unanswered prayer is actually a blessing in disguise. This response, apart from being unable to satisfy the wronged, has far reaching undesirable consequences. The oppressed are asked to accept the state of affairs as God's better judgment and take all injustice and unfairness committed against them lying down, silently and happily!

Allah listens To His Favorites

Another traditionalist belief is that God answers prayers only of His chosen people. This has resulted in the proliferation of the so-called 'intermediaries' forming a link between Man and God. Countless people refer to these 'exalted' men – dead or alive! – to forward their requests to God, with a recommendation.

Divinity Of The King

Obviously, this particular belief is a product of the autocratic period of Muslim history. It was to the benefit of the absolute rulers to have the people believe that 'the king is God's shadow on Earth.' It was, therefore, natural for the masses to imagine God in the same world as they experienced their earthy rulers (His shadows), complete with His divine court, guards, secretaries, intermediaries, and above all, a whimsical process of decision-making.

About the ‘intermediaries’, the Quran says: ‘They are men just like yourselves (7/194). About dead ‘agents’ (whose graves are so very revelry visited by millions), it says: They just can’t hear you. Even if they do, they cannot respond! (35/14). Also ‘they remain ignorant of whatever you say to them’ (46/5); ‘they don’t know even about their own resurrection’ (16/21). How can such dead people help the living?

How Are Prayers Answered?

As to the question how, then, are prayers answered? Let us once again look at verse (2/186) which says: When My men ask you of Me, tell them I am close to them and respond to everyone who calls Me.’ It goes on: ‘If you wish an answer from Me, you must be convinced of My guidance and obey Me.’ Sura Shura says: ‘Those get their answers who are convinced and do good (proper and fruitful) deeds’ (42/26). Sura Momin: ‘You call Me, I’ll respond. (But) those who defy and transgress, they will enter Hell, humiliated! (40/60). Sura A’raaf, while talking about ‘calling out to Allah,’ says: ‘He certainly doesn’t like the transgressors (7/55). ‘Those who reject the laws of Allah do not get their prayers answered (40/50). Conviction followed by continuous diligence to adopt and implement His laws, is the fundamental requirement for getting prayers answered. In fact, such men work constantly at it round the clock and ‘call out to their Preserver, in hope and despair, and keep available for common use what He has given to them! (32/15,16)

Sura Aal-e-Imran contains a beautiful account of this concept. I quote here my interpretation of it from my work Mafhoom-al-Quran:

> For those who put their reason to use, there are great signs in the creation of the universe and the cycle of day and night of the scope and validity of His laws.
>
> It is for those men of reason who constantly keep in view Allah’s laws be they standing, sitting, or lying down; they keep pondering over the creation of the universe. Their research makes them convinced and say: ‘O our Preserver! You have created this universe neither in futility nor to destructive purposes. You are too great to have done it so! Grant us the ability to (benefit properly from the universe as a result of our scientific research and practical experimentation and thus) save ourselves from destruction.

> Nations who do not follow this course of action see their efforts wasted away and they plunge into a humiliating, miserable existence with help coming from nowhere.
>
> It is desirable to harness the forces of Nature and use them for the universal sustenance of Man, not for his destruction. This can be done only by a people who are firmly convinced of the divine guidance.
>
> Therefore, these men of reason also say: ‘O Our Sustainer! We heard a caller calling us to be convinced of the validity of our Preserver’s Laws. We responded to his call and became convinced.
>
> Then these convinced men of reason desire in their hearts (and they pray): “O our Sustainer! Please save us from the consequences of errors we make. Make up for our little slips and mistakes of judgment and application. Please give us the eventual end of a prosperous existence.
>
> O our Preserver! Please keep Your promise You have made, through Your messengers (Divine Revelation), of bestowing us with prosperity and success. Please don’t let us be humiliated on the Dooms Day.
>
> We are sure you are a keeper of promises! (3/189-193)

To all this, Allah’s reply is the following:

> ‘Their Preserver then responded to them: “(I have heard your prayers, but you must remember that) I don’t waste the work of a worker – man or woman – (and respond fully to an action) …” (3/194)

Prayers of Divine Messengers Answered

Let us now make things even clearer by looking at the situation of the exalted messengers of Allah praying and having their prayers answered. About Noah, it is said that he called out to Allah when his people opposed him vehemently. Allah says: ‘So We are the best (of those) who answer (prayers) (37/**75**). How did He do it? ‘We revealed upon him (the way of) constructing an ark!’ (23/27).

When Moses was told to free Israelites from the oppressive slavery of the Egyptians, he prayed for divine help in view of the gravity of the mission. Allah answered: ‘O Moses, We (hereby) grant what you seek’ (20/30). ‘Go, you and your brother (to the Pharoah), with My word; don’t you be lax with it! (20/42).

Elsewhere; '(Allah) said, "I have answered your prayer. So, be steadfast and never follow those who do not know" (10/89).

Again, when Moses prayed for his people to be granted bounties of here and the hereafter, he was told it could happen only if "they follow the last Messenger; Our blessing, although encompassing the entire Universe, can be obtained by men if they are convinced of Our Laws, abide by them and provide sustenance for others" (7/156-157).

Zakariya's prayer for a son was granted right away in principle but materialized only when "We cured his wife for her" (21/89-90).

It is obvious, therefore, that prayers are answered only when the relevant laws are properly applied. Praying without appropriate action is commented upon in Sura Ra'ad with the allegory of a thirsty person standing inactive on the banks of a river. Such prayers all go wasted (13/14).

Prayer Of The Oppressed Answered

A possible comment on the above can be the intriguing question. Does God not at all answer prayers of the oppressed? The Quran's reply to this is in the affirmative. Yes, their prayers are answered. Following is how it happens. Look at a leaf from the Muslim history of the early period.

Years of consistent hard struggle had resulted in the Muslims' own sovereign rule in the town of Yathrib (Medina). In the meantime, Muslims still trapped in Mecca came under increasing oppression at the hands of the Quresh (the ruling tribe of non-Muslims). The oppressed Muslims prayed to Allah for their salvation. Allah said to the Muslims in Medina: 'what has come upon you that you do not take up arms in Allah's way? The weak men, women and children call out to Us: "O our Preserver! Take us out of this town of transgressors. Please have some helper and friend for us!" (4/75).

The Quranic State Answers!

Clearly, Allah does not help the oppressed directly. He does it indirectly through other men. For the first thirteen years of the movement, the Muslims' prayers (under the oppression of the Quresh in Mecca) and answered by words of advice, consolation and suggestions of remaining steadfast, etc., Allah said, "who is the One who answers the call to Him of the desperate and removes their predicament?

He (does it when He) makes you the inheritors of Earth!" (27/26). Please remember that this inheritance is a result of their convinced good deeds (24/53).

Elsewhere, about the Muslims the Quran says: 'They are the ones who respond to their Preservers' beckoning and establish sala (a comprehensive system of adopting Allah's system), made decisions through mutual consultation, and keep for common use whatever sustenance they have" (42/38). This method of ruling through mutual consultation, established to create and sustain a fair and just social order, is the same employed to salvage the Israelites from the shackles of Egyptian bondage. Sura Qasas:

> 'The Pharoah had carried transgression to extremes. He operated a policy of 'divide and rule' by oppressing and neutralizing the potentially dangerous while promoting its bounties, i.e., inheritance and power in the land where they could have their own sovereign government.' (28/4-6)

Why Pray?

Let me ask you to ponder — just for a few seconds — upon the question: why and when do the oppressed need to pray to God? They do so in an unjust, unfair and oppressive society which is oblivious to their predicament, abandons them by neglecting them completely.

Not So in a Just Society

They see no other recourse open to them than to plead with the Almighty. But this never happens in a fair and just society, simply because there is no need to.

Omar's Eloquent Statement

This fact was so very eloquently illustrated by Omar, the second Caliph, when he announced:

> 'I have been entrusted with the responsibility of the Caliphate so that I stop your prayers on their way and not let them reach Allah!'

That sums up the purpose and target of the Quranic social order.

Muslim Prayers Are Collective

In such a society, no one needs to pray to the Almighty because His representatives on Earth are taking care of them. In such a society there are no individual prayers. That explains that fact that all the Muslims prayers mentioned in the Quran are collective. A glance at those can make clear their purpose. Some of them are:

1. O Preserver of all worlds! Guide us on the right path, the course of those blessed by You! (1/5-7)
2. O our Sustainer! Bestow nice things on us here as well as in the hereafter. (2/201)
3. O our Sustainer! Give us steadfastness so that we don't falter. Save us from the consequences of small errors. Give us triumph over the enemy. (3/146-147)
4. O our Sustainer! Ignore our errors and forgetfulness. Don't let us slip back into ignorance like nations of the past. Give us strength to carry out our responsibilities. Give us triumph over those people who oppose your system (2/286; 3/15).
5. O our Preserver! Don't' let us go astray now that we are on the right path. Please keep us provided for (3/7).
6. O our Sustainer! Keep promises you have made to us through Your Messengers (3/192-193).
7. Let us be among the doers of good deeds (5/83). Not among the transgressors (7/47).
8. Let the Right decide the conflict between us and our opponents (7/89).
9. O God! Save us from the oppressors (10/85).
10. Prayers to be saved from the punishments in Hell (25/**65**).
11. Let our families (wife and children) be the cause of happiness, let us be the leaders among law-abiders (25/74).
12. O our Sustainer! Take us, as well as our brethren gone before us with conviction, under Your protective fold. O God! Keep our hearts free of malice for our brothers (59/10).
13. (Muslims praying in Heaven to) complete our light (66/8).

It is time now to consider the most important question one may ask at this point: ‘Granted that prayers are collective, what do they achieve?’ this being a pivotal question needs careful consideration.

What Prayer Achieves

Human action springs from desire. Desire and the subsequent will, directly influence an action and its performance. It prepares one psychologically for the forthcoming action. The verbalization of desire is prayer, as Iqbal very aptly puts it in one of his poems for children:

My desire is on my lips as prayer

Be my life as a candle fairer

Psychological Change

Psychological change in a person, and for that matter, in a nation, has far reaching effects. One can only wonder at the linguistic depth the pre-Islamic Arabic had reached. The simple nomads of the ‘jahliya’ (ignorance) period used to milk their animals but not quite, leaving a little in there to induce down more. That little amount of milk left was called (the caller; the prayer). This illustrates prayer in the human context, i.e., the condition which spurs emotions into action for subsequent performance. Expression of one’s desires is prayer.

It is important to consider two fundamental points regarding desire.

Keep Your Desires In Link With Allah’s Will

First, the nature of desire. The Quran suggests the standard of a Muslim’s desire as: ‘and don’t desire but what Allah wants – (81/29) i.e., abide by His laws and follow His system. As mentioned earlier, the sole purpose of human endeavor is to develop one’s personality. The standard to measure this development is to see how much of ‘Godness’ is reflected in one’s personality. Of course, one kind of divine attributes are beyond humans (e.g., eternity and immortality). But humans can develop in themselves the godly attributes of benevolence, sustenance, kindness, etc. This depends upon having a desire to develop such attributes. So, men should desire what God wants them to which can be found in His Revelation (the Quran) without which: Man instead of praying for good, prays for bad, in his haste’ (17/11).

What is Remembering God

Second, the objective of desire must always be kept in view. The Quran says the convinced "keep in view Allah's law standing, sitting and lying" (3/191). Again, in Sura Ha'Meem: Those who say, "Allah is our Preserver", and then stand firm, they have angels descending upon them to console and comfort them with their support here and in the hereafter, and give them glad tidings of Paradise promised to them. There (in Paradise) you will get what you wish and will happen what you pray for (41/30-31). A Muslim, by definition, does not desire (pray) for anything out of line with Allah's Will. That, therefore, guarantees answering of the Momeneen's (the convinced) prayers.

Regarding the help by angels the Quran has clearly called it "psychological satisfaction" (8/10) resulting in steadfastness (8/11).

Prayer for Others

As far as praying for someone else is concerned, it is nothing but the expression of one's good wishes. It acts as moral support for others. One case in point is the practice of praying for the dead (who of course remain unaffected) which is a solace to the bereaved. Such acts are socially desirable to promote gregariousness. That is why the Messenger was told to appreciate and facilitate those bring in their donations because your prayer is satisfying for them" (9/103).

Individual Prayers of Messengers

The Quran reports some individual prayers of divine Messengers. Job (Ayyub) prayed to Allah in his predicament and He salvaged him (2/83, 84); Jonah (Youis) called out to Him and his calamity was alleviated (31/87-88). In the first place, the Quran reports no details as to how such help was given. Secondly, and fundamentally, it is impossible for us to fully comprehend the mechanism of divine Revelation and the nature of the Allah - Messenger relationship. Therefore, it is better left at that. The Messenger Mohammad's individual prayer mentioned in the Quran is ideal for everyone: say, "O Preserver! Give me knowledge aplenty!" (20/114).

Prayer is Blessing and Denying Blessing is Denying God!

A commonly-held belief is that rejecting the mechanism of prayers makes one deny the benevolence (traditionally translated as 'mercy') of God, which is denying God and His powers. Let us see what (rahma) is in the Quranic context. For that, we must recall the concept of 'tauba' (repentance) mentioned earlier in the book.

The ancient Judaic jurisprudence had no place for ‘tauba’. Every little error had to be punished. The Hindu concept of ‘Karam yoge’ (reincarnation) held a similar position. The Christians believe in ‘the original sin’; Christ went to the cross to absolve Man of sins; anyone believing in the Christ’s being the Saviour gets salvation; that is the basis of the ‘God is Mercy’ belief.

Rahma

The Quran holds a view different from both of the above. God’s Law of Returns contains both justice and clemency, the latter having a concept different from the Christians. The Quranic concept of clemency may be illustrated by the example of a person putting his/her hand in a flame. The burning which results naturally in pain is justice. At the same time, Nature has created cure and treatment of burns. That is Allah’s clemency (rahma). This fact can be useful only to those who know and utilize it. This, in the Quranic sense, is tauba (repentance), i.e., efforts to rectify a mistake. This point is aptly illustrated in the figurative story of Man’s creation. Both Man and the Devil erred but when as Man repented and was willing to rectify his error, the Devil refused to confess, standing defiant. God was clement to Man but not to the Devil.

The Quran elaborates it in Sura Az-Zumr: “Say (O My Messenger) to those people who have done wrong to themselves, “Don’t lose hope of Allah’s clemency. Verily, He has created means of recovering all falterings. He certainly is the Protector and the clement! Come back to your Preserver and submit to Him before your error bears result, after which no one will be able to come to your aid (39/53-55). Elsewhere, it is clarified thus: “When they, who are convinced of Our Laws, come to you (My Messenger), say to them: “Peace be upon you as your Preserver has bound upon Himself to be clement, i.e., anyone of you who unknowingly falters, then repents and rectifies it, shall find Allah protecting and clement” (6/54).

This is not to be taken as a license to commit wrongs. It says: “This is how your Preserver shall be clement to you. But if you return (to your ways Our system (of punishment) shall return to you” (17/8).

Tauba (repentance), therefore, is only for those who are convinced of the natural Law of Returns. The disbelievers, on the other hand, have been said to be hopeless of divine clemency. Sura Ankaboot says: ‘Those who reject Allah’s Law and His principle of returns, are the ones hopeless of My clemency (29/23).

Elsewhere, the Quran says: ‘That who loses faith in his Preserver’s clemency, has surely lost his way’ (15/56). Contrary to this: “Verily, those who are convinced and abandoned (everything for Allah) and struggled in Allah's way, seek Allah's clemency. Certainly, Allah is Protector and Clement (2/218). Allah's clemency (rahma), therefore, is for those who strive. Says the Quran:

> 'Even among the Convinced, the lethargic – save the invalid – can never be at par with those who strive with their selves and wealth in the way of Allah. He holds the strugglers in a higher status than those who shirk action. The system benefits all but the endeavoring are graded higher than the passive ones – higher status and protection and clemency. Certainly Allah is Protector and Clement' (4/95-96).

Finally, consider Sura A'raaf where Moses prayed for His blessing for Israelites and got this reply: 'Surely, My clemency encompasses everything. But among men, only those want it who abode by His laws, work for universal sustenance of mankind, are convinced of the validity of laws, and follow the illiterate Messenger in the future, whom they find mentioned in the Torah and the Bible – he will promote good and forbid wrong, allow nice things and disallow bad, break their unnatural yoke of slavery, lighten them by relieving them of burdensome slabs. That is the only way to obtain Allah's clemency, covering the entire universe in its benevolent clouds! (7/156-157).

****